Edited

20-3/10

1/10

جرس

وامق جونپوری

دانش محل۔ امین الدولہ پارک لکھنؤ

طبع اوّل ——— جولائی سنہ ۱۹۵۰ء

قیمت ——— تین روپے آٹھ آنے

سول ایجنٹ

دانش محل - امین الدولہ پارک لکھنؤ

بیگم احمد مجتبیٰ نے الواعظ صفدر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر شائع کی

فہرست

پیش لفظ

شاعر ہو یا عام انسان اُس کے لئے زندگی اور موت، امن اور جنگ، آسودگی اور بھوک، انصاف اور ظلم، مساوات اور طبقاتی استحصال، ترقی پسندی اور رجعت پرستی میں انتخاب کرنا ضروری ہے۔ بعض حالات میں ان متضاد عناصر کے درمیان ایک قسم کا وقتی سمجھوتہ ممکن تھا لیکن آج کے بحرانی دور میں جسے اس تضاد کا علم اور اسے دور کرنے کی فکر نہیں ہے وہ اُن قوتوں کا دوست نہیں کہا جا سکتا جو انسان کو انسان بنانا چاہتی ہیں۔ ان متضاد عناصر سے آنکھیں چرانا اُن طاقتوں کو مضبوط بنانا ہے جو دنیا کو بہتر بننے سے روکتی ہیں۔ آج کلچر، ادب اور شاعری کا کوئی نام لیوا اُس وقت تک زندہ رہنے، اپنے خیالات و افکار سے ترقی کے خواہش مندوں کو متاثر کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ مثبت انداز میں موت کے مقابلہ میں زندگی کا، جنگ کے مقابلہ میں امن کا، ظلم کے مقابلہ میں انصاف کا اور طبقاتی استحصال کے مقابلہ میں مساوات کا علم بلند نہیں کرتا۔

یہ ایک طرح کی جانبداری ہے لیکن یہ جانبداری تمدنی افکار اور شعر و ادب میں صحت مند حسن اور توانائی پیدا کرتی ہے۔ یہ بہار کی پیامبر اور زندگی کی امین بن جاتی ہے اور فنی تیوروں کے اندر کھلم کھلا ایک سماجی مقصد کی اشاعت کرتی

ہے۔ دورِ جدید کے کم وبیش سبھی اچھے شاعر کسی نہ کسی شکل میں اِس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔

"جرمن کا شاعر اسی گروہ سے تعلق رکھتا ہے اور بنیادی طور پر اس فلسفۂ زندگی کو مانتا اور اُس کے لئے اپنی شاعری کے ذریعہ جدوجہد کرتا ہے جو سرمایہ داری کے موجودہ بحران میں امن اور زندگی کا پیام ہے۔ سرمایہ داری کی حقیقت پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی بے نقاب ہو چکی تھی لیکن دوسری جنگ عظیم اور اُس کے بعد کے مذبوحی تشنج نے تو اُسے اُس کے سارے گھناؤنے پن اور عریانی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اس لئے اس کے متعلق خود دھوکے میں رہنا یا دوسروں کو دھوکا دینا اس تیسری جنگ عظیم کی دھمکی دینے کے برابر ہے جسے سرمایہ دار ممالک دنیا پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ادب اور کلچر کا کوئی طالب علم جس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ جس بحران کی ابتدا سرمایہ داری کے زوال کے ساتھ ہوئی تھی وہ اب مرتے مرتے عوام دشمنی کا آخری کھیل کھیلنا چاہتا ہے۔ اس کھیل میں انسان دوستی اور عوام دوستی کا راگ گانے والا ادب بھی نفرت اور ملامت کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور بڑی بڑی ترکیبوں اور چالوں سے ادب اور شاعری کے سماجی مقصد کی اہمیت گھٹانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دورِ جدید کا شاعر اس وجہ سے بڑی ذمہ دارانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اُس کے سامنے دونوں راستے ہیں اور انتخاب کا بار اُسی پر ہے کہ وہ موت اور زندگی میں، زہر اور امرت میں کس چیز کو پسند کرتا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ شاعری کے موضوع ان گنت ہیں۔ اُس کے محرکات کئی ہیں لیکن شاعر کی آزادی کے نام پر کسی کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ موت کی سوداگری کرے اور وہ زہر پھیلائے جو سماج کی باڑھ کو روک دے۔

ہو سکتا ہے کہ بے سوچے سمجھے محض لفظوں کے حسین طلسم سے متاثر ہو کر کوئی شاعر کچھ دنوں تک اِدھر اُدھر کے موضوعات پر لکھتا رہے لیکن یہ بات ناممکن ہے کہ وہ دونوں راہوں میں سے کوئی راہ چنے بغیر بہت دنوں تک پُر اثر اور دل نشیں شعر کہتا رہے۔ چنانچہ جب قومی اور بین الاقوامی زندگی میں وہ نازک موڑ آجاتے ہیں جہاں خیالات کی پرکھ ہوتی ہے۔ اس وقت سماج کی ایک اہم فرد ہونے کی حیثیت سے شاعر پر بھی اظہار خیال کا بار پڑتا ہے اور ہر صاحب نظر کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کن محرکات سے اثر لیتا اور زندگی کی کن قدروں کو عزیز رکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں دوسری جنگ عظیم، اُس سے پیدا ہونے والے مسائل، فاشزم اور اشتراکیت، امریکی سرمایہ داری، ایشیا اور یورپ میں عوام کی بیداری، ہندوستان کی نام نہاد آزادی، قیام پاکستان، فرقہ وارانہ فسادات وغیرہ اہم واقعات ہیں اور ان کے متعلق مختلف قسم کے لوگوں پر مختلف قسم کے ردعمل ہو سکتے ہیں۔ یہی ردِ عمل شاعر کے فلسفۂ خیال اور رجحانات کا تعین کریں گے انھیں کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے شاعر اپنے عقائد اور اپنی تصوّراتی بنیادوں کا پتہ دے گا۔ نقاد کی نظر ان میں ہم آہنگی کی جستجو کر کے یہ بتا سکے گی کہ اُسے زندگی کی کن قدروں سے محبت ہے۔ علم و فن، سائنس اور فنون لطیفہ ہر ایک کی سماجی بنیادیں معلوم کرنے کی یہی کسوٹی ہے کہ جب انسان مرگ و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہوئے ہیں اس وقت انھوں نے کس کا ساتھ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ شاعر اپنی فنی دشواریوں کی وجہ سے اظہار خیال کے جو طریقے اختیار کرے گا اُس میں فلسفہ و سائنس کے مضامین کا اندازہ پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی حقائق کے بارے میں اس کی رائے کہیں ایک شعر سے اور کہیں ایک نظم سے معلوم ہو سکے گی۔ واقعات سے اُس کا جذباتی تعلق شاعری میں خلوص، گرمی، فنی بلندی اور عظمت پیدا کرے گا، اس طرح موضوع

اور فن میں وہ تعلق قائم ہوگا جس سے اعلیٰ شاعری کی تخلیق ہوتی ہے۔

یہ تو معلوم نہیں کہ وامق نے شاعری کب شروع کی لیکن یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے دوسری جنگ عظیم کے ابتدائی سالوں میں لوگوں کو اپنی شاعری کی طرف متوجہ کیا۔ اس وقت اردو کے اکثر نوجوان شاعر ایک رومانی کرب میں مبتلا تھے۔ نہ محبت میں کیف تھا نہ شراب میں مزا۔ نہ آوارہ گردی میں لطف تھا نہ ملازمتیں اختیار کرنے میں سکون، نہ سیاسی اداروں پر پورا بھروسہ تھا نہ راہِ عمل کا ٹھیک ٹھیک تعین ہوا تھا۔ محبوبہ کو ساتھی بنانے کا جذبہ تھا، انفرادی اور قومی آزادی کی خواہش تھی، سیاسی اداروں میں شریک ہو کر کام کرنے کی اُمنگ تھی، عناصر فطرت پر قابو پانے کا حوصلہ تھا، عوام کی جد و جہد میں شریک ہونے کی آرزو تھی لیکن سب پر رومانیت کا غلبہ تھا۔ شعراء کے انفرادی شعور کے لحاظ سے ان کی شاعری میں یہ عناصر جگہ پاتے تھے، جو شخص ترقی پسندی کی منظم تحریک سے جس قدر وابستہ تھا اسی قدر اُس کے یہاں نصب العین واضح اور خیالات بے باک تھے۔

وامق اِسی زمانے میں ترقی پسندی کی تحریک سے بھی متاثر ہوئے اور اُس کے رکن بن گئے۔ ان کی ابتدائی شاعری میں یہ سارے جذبے کسی نہ کسی شکل میں نظر آتے ہیں۔ ایک مبہم انداز میں "روحِ عصر" اُن کے اشعار میں گھلی ہوئی ملتی ہے مثلاً شرابی میں جوان زندگی کی وہ بے کیفی اپنے شباب پر ہے جو صحیح راستہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس نظم میں وامق ان جوانوں کی نمائندگی کرتے ہیں جو اس وقت کے نظامِ زندگی سے، سرمایہ داری سے، سماجی بندشوں سے، مذہبی سخت گیریوں سے متنفر ہیں۔ جو اپنا رشتہ محنت کش طبقہ سے جوڑنا چاہتے ہیں۔ یہی کیفیت، عید، اُس پار، پاپی وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔

کیوں ڈراتے ہیں مجھے یہ کجکلاہانِ زمیں
خود بنے بیٹھے ہیں جو صدہا جرائم کے امیں
خون سے ہے آج تک رنگین جن کی آستیں
یہ نہیں تو کس لئے میں نے اٹھایا جامِ مے

پی رہا ہوں اپنی قوت آزمانے کے لئے
پی رہا ہوں نقش کہنہ کو مٹانے کے لئے
پی رہا ہوں تاش کے اس گھر کو ڈھانے کے لئے
یہ نہیں تو کس لئے میں نے اٹھایا جامِ مے

غم غلط کرتا ہوا بڑھتا چلا جاؤں گا میں
سینۂ شمشیر پر چڑھتا چلا جاؤں گا میں
اپنی رفعت کے رجز پڑھتا چلا جاؤں گا میں
یہ نہیں تو کس لئے میں نے اُٹھایا جامِ مے

سیکڑوں صدیوں کا ہے ہیجان سینے میں مرے
ان گنت بدلوں کا ہے ارمان سینے میں مرے
کروٹیں لیتا ہے اک طوفان سینے میں مرے
یہ نہیں تو کس لئے میں نے اُٹھایا جامِ مے

اس رومانی دور سے گذرنے کے بعد وامق کی شاعری شعور کی نئی منزل میں داخل ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ اس جانبدار کی حیثیت اختیار کرنے لگے جو اس نظام کو پسند کرتا ہے جس کی بنیاد عوام پر ہو۔ اِس احساس کی ایک خوبصورت جھلک اس نظم میں ملتی ہے جس کا عنوان ہے "اپنی تصویر سے"۔ حالات نے مطالعہ نے شعور میں جو تغیر پیدا کیا اِس نظم میں اُسے اپنی ہی زندگی کی دو منزلوں میں

دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسی زمانے میں بنگال کا قحط ہوا جس نے ترقی پسندوں کی روح تک کو زخمی کر دیا اور وامق نے اپنی مشہور نظم "بھوکا بنگال" لکھ کر مقبول شعرا کی صف میں اپنی جگہ بنا لی۔ اس عہد آفریں نظم کا آہنگ، اس کا اثر، اس کی سادگی اور اس کا اجتماعی جوش سب غور سے دیکھے جانے کی چیزیں ہیں یہ وہ زمانہ تھا کہ ترقی پسند اپنے ذہن کی پوری طاقت سے زندگی اور شاعری کے رشتے کو سمجھنے میں لگے ہوئے تھے اس لئے انھیں اس نظم میں مستقبل کی عوامی شاعری کی جھلک بھی نظر آئی۔ اسی زمانے میں وامق نے اپنی مختصر مگر پر اثر نظم "فدو ناتا نانیا" لکھ کر روس کو خراج عقیدت پیش کیا۔ "ماضی کی آخری ہچکی" میں قدامت پسند شاعروں پر چوٹیں کیں، "مزدوروں کا کورس" لکھا اور "جنتا کی لڑائی" اور "قدم کے جھنکار" میں فاشزم اور جاپانی عسکریت سے نفرت کا اظہار کیا۔ ان نظموں کی زبان عام طور سے آسان ہے اور اگر آسان نہیں بھی ہے تو پیچیدہ علامتوں اور اشاروں سے خالی اور ابہام سے پاک ہے کیونکہ ان کا موضوع محض داخلی اور غنائی نہیں ہے لیکن ابھی یہ دور ختم نہیں ہوا تھا کہ وامق کی شاعری علامتوں اور اشاروں کے جال میں گرفتار ہو گئی، گو وامق کے یہاں ایسی نظموں کی بہتات نہیں ہے پھر بھی "الف لیلہ"، "آنکھ"، "لگتے ہی"، "روزن کی آڑ سے" اور "مائٹی ایٹم" میں علامتوں کا استعمال بہت ہے۔ بعض علامتیں واضح ہیں بعض مبہم۔ یہاں بھی وہی بات ہے جن نظموں کے موضوع میں داخلیت زیادہ ہے وہاں ابہام زیادہ ہے اور جن میں خارجی رنگ ہے وہاں صفائی ہے۔ "مائٹی ایٹم"، ایٹم کے ظالمانہ استعمال کے خلاف ایک شاعر کا احتجاج ہے۔ آج پھر یہ سوال پیش ہے کہ ایٹمی توانائی تخریب کے کام آئے یا تعمیر کے۔ سرمایہ دار ممالک امریکہ کی سرکردگی میں ایٹم سے دنیا کو تباہ کرنے کے درپے ہیں اور انسان دوست قومیں روس کی رہنمائی میں اسے صرف تعمیری کاموں

کے لئے استعمال کرنے پر زور دے رہی ہیں، گو یہ نظم ۱۹۴۵ء میں ہیروشیما کی ایٹم باری کے بعد لکھی گئی لیکن اس میں جس مقصد کا اظہار کیا گیا ہے وہ آج بھی درست ہے۔

فکرِ انسان کا اس درجہ مزین شہکار
صرفِ بربادیٔ تہذیب ہوا جاتا ہے

....

ہم نے چاہا تھا کہ اس قوتِ بے پایاں سے
اپنی خود ساختہ دُوزخ کو بنا لیں جنت
نہ کہ امید جو کچھ تھی بھی وہی مٹ جائے
جنسِ قربانی کی دنیا میں رہی کیا قیمت
پھٹ کے ذرّے بھی فنا ہو گئے کچھ کر نہ سکے
دامنِ ذلیت تہی کر گئے اور بھر نہ سکے

موت اور زندگی میں زندگی کا انتخاب وامق کے سماجی مقصد کی مکمل وضاحت کرتا ہے۔

وامق کی نظموں میں "مینا بازار" مخصوص توجہ کی مستحق ہے۔ اس میں شاعری اور مقصد کا حسین امتزاج ہے، مرقعے خوبصورت، پُر اثر اور متنوع ہیں۔ موسیقی دھیمی اور غمناک ہے، الفاظ رواں اور سادہ ہیں۔ علامتیں واضح اور خلوص گہرا ہے۔ اس میں سماجی حقیقت نگاری کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ یہ نظم غالباً بنارس میں لکھی گئی ہے، اس لئے اس کا مقامی رنگ بھی نظم کی فضا اور اثر میں اضافہ کرتا ہے۔ اس نظم سے وامق کی شاعرانہ صلاحیتوں کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔

یوں وامق کی شاعری برابر ترقی کرتی، زندگی کے مسائل کو سمجھتی سمجھاتی، وسعت اور گہرائی پیدا کرتی بڑھتی رہی ہے تقسیم ہند کے بعد انھوں نے کئی پر اثر نظمیں لکھی جن میں سے بعض "جرس" میں بھی شامل ہیں۔ ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات بھی شعور کی حقیقت پسندی کے لئے ایک کسوٹی بن گئے۔ ان نظموں سے وامق کا نقطۂ نظر بھی معلوم ہوتا ہے جو اُن کے رویہ کی صحت مندی پر دلالت

کرتا ہے۔

پیش لفظ کے ان چند صفحوں میں وامق کی شاعری کی تنقید پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ ان صفحات میں ان کی غزلوں کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا اور نہ اُن کے فن کے متعلق، کچھ دنوں سے انھوں نے زیادہ تر غزلیں لکھی ہیں اور انھیں کے محدود ڈھانچے میں حقائق کی نامکمل اشارے کئے ہیں۔ وقت ہے کہ آج کے مسائل پر، عوامی جدوجہد پر، سرمایہ داری کے بحران پر، امن اور تیسری جنگ پر اور اُن اَن گنت موضوعات پر جو آج کے انسان کے سینے میں ہیجان بپا کئے ہوئے ہیں نظمیں لکھی جائیں جن میں حقیقت کے ساتھ فنی آراستگی ہو اور شاعر کے دل کی دھڑکنیں عوام کے دل کی دھڑکنوں سے مل کر خوبصورت نغمے پیدا کریں۔ میری یہ خواہش اس یقین پر مبنی ہے کہ وامق کے اندر غیر معمولی شاعرانہ صلاحیتیں ہیں جو عوام کے کام آئیں گی اور اردو شاعری کے سرمایہ میں اضافہ کریں گی اور وقت کے ساتھ ساتھ وہ خامیاں ان کے کلام سے دور ہوں گی جن سے ابتدا میں ہر فنکار کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔

ماہل۔ اعظم گڑھ

سید احتشام حسین

اعتراف

اب سے دس برس پہلے میرے ایک دوست (حکیم مجے) نے بڑی محبت کے ساتھ پوچھا کہ تم کو اس قدر اشعار یاد ہیں اور تم بہ مشکل نثر میں باتیں کرتے ہو تو پھر خود شعر کیوں نہیں کہتے۔ میں نے اس خیال سے کہ کون نثر میں جواب دے کر بات کو طول دے اُن پر اپنی قابلیت کا سکہ جمانے کے لئے وہی بڑا پرانا شعر۔ شعر گفتن گرچہ در الخ۔ پڑھ دیا۔ مگر وہ بھلا آسانی سے کب ماننے والے آدمی تھے۔ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے۔ واقعہ یہ تھا کہ میں ہمیشہ شعر کو معجزہ اور شاعر کو فوق البشریت کا حامل سمجھتا تھا اور اگرچہ میں شعر کہنے کی ایک دبی دبی سی خواہش دل میں ضرور پاتا تھا مگر میں نے اس جذبہ کو کبھی عملی جامہ پہنانے کی جرائت نہ کی۔ ان کو پھر سمجھایا کہ بھئی شعر کہنے کے لئے چاہیے دو وقت کھانا نہ ملے مگر عشق کرنا بہت ضروری ہے وہ بولے پہلے شعر کہنا شروع کر دو کچھ دن کے بعد عشق بھی ہو جائے گا۔ اور کم از کم تمھارے شعر پڑھنے اور سننے والے تو ضرور ہی تم کو عاشق سمجھنے لگیں گے۔ محبت کرنے کو میرا بھی جی چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے غزلیں کہنا (بنانا) شروع کر دیں۔ بالکل روایتی قسم کے اشعار۔ تصوف۔ جمالیات۔ معاملہ بندی اور چنیں و چناں۔ سال بھر کے اندر اندر مجھ کو واقعی محسوس ہونے لگا کہ جیسے میں کسی پر عاشق ہوں اور عمر کے تناسب

کے ساتھ جو اچھی صورت نظر آتی اس کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا کہ کہیں میں اسی پر تو
عاشق نہیں ہوں۔ یہ سلسلہ دو سال تک جاری رہا۔ سچ مچ کی محبت بھی ہوئی مگر وہ
بھی مجبوراً ترک کرنی پڑی۔ کچھ دنوں تک جنون و خرد کی جنگ رہی اور آخر
میں خرد کا پلہ بھاری نکلا۔

اس وقت جنگ عالمگیر پورے شباب پر تھی۔ سارے ملک میں بھوک
اور بیماری کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ فرنگی اور امریکی سپاہی سڑکوں اور گلیوں
کو روندتے پھر رہے تھے۔ پست متوسط طبقے اور غریبوں کے گھر ویران اور چکلے خانے
آباد ہو رہے تھے۔ مذہبی رہنما جنت اور دوسرے جنم کی بشارت دے دے کر
صبر وشکر کی تلقین فرما رہے تھے مختصر یہ کہ ہر جانب زندگی اور اس کی حسین
قدریں فاشیت کے ہاتھوں دم توڑ رہی تھیں۔ یہ حال دیکھ کر ایسا محسوس
ہونے لگا کہ جس قسم کی روایتی شاعری میں کر رہا ہوں وہ ایک ناقابل معافی اخلاقی
جرم ہے۔ یہی وہ وقت بھی تھا جب ملک کے رجعت پسند ادیب ادب برائے
زندگی کے مقابلہ میں اپنے آخری مورچے سے جنگ کر رہے تھے۔ اس جنگ سے
مجھ کو بڑا فائدہ ہوا اور تھوڑے ہی عرصہ میں میں اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ ادب کو
زندگی کا آئینہ دار ہونا چاہئے۔ اب میں محض اپنے ذاتی مشاہدات اور محسوسات
سے کام لے رہا تھا اور اس طرح میرے صحیح وجدانِ مقصد کے دور کا آغاز ہو
اور جیسے مجھ کو کچھ تسکین بھی ہونے لگی "جرس" اسی دور کی نظموں اور غزلوں کا
مجموعہ ہے۔ اس میں میری شاعری کے اولین دو سال کے افکار شامل نہیں ہیں
وہ بظاہر بہت حسین مگر بے روح تھے۔ اس مجموعہ میں آپ کو چند ایسے بھی موضوع
ملیں گے جو بادی النظر میں شاعرانہ موضوع کہلائے جانے کے مستحق نہیں مگر فنی الاص

بیان ہوتا ہے جو اس کو شاعرانہ یا غیر شاعرانہ بنا دیتا ہے۔ "جرس" میں آپ کو بحوری تجربے بھی ملیں گے۔ بحر اور ہیئتِ نظم کا موضوعِ سخن سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہ ایک لمبی بحث ہے جس کی گنجائش یہاں نہیں ہے اس لئے اس کی پرکھ آپ کے مذاق پر چھوڑتا ہوں۔ اس مجموعہ میں آپ کو کہیں کہیں زبان کی غیر مانوس ترکیبیں اور انہج بھی ملیں گی۔ متروکات بھی ملیں گے مگر تھوڑی توجہ کے بعد وہ آپ کو معنویت اور موقع کے اعتبار سے ناگوار معلوم ہوں گے۔ کیا آپ قائل نہیں ہیں کہ باموقع تصرف سے مہمل الفاظ بھی بامعنی ہو جاتے ہیں۔ اب رہا سوال متروکات کا تو میں یہ عرض کروں گا کہ اگر اساتذہ متقدمین کو نسخ کا حق حاصل تھا تو ہم کو پھر سے ان کے استعمال کا بھی حق حاصل ہے اور یوں بھی ترقی پسند ادب زبان میں اضافہ چاہتا ہے نہ کہ کمی۔ جہاں تک قوافی کا تعلق ہے۔ میں صوتی قوافی کو جائز اور مستحسن سمجھتا ہوں۔ مثلاً "راستے اور واسطے"۔ "حیات اور نشاط" وغیرہ۔

ایک بات اور شاید آپ کی دلچسپی سے خالی نہ ہو گی۔ "جرس" کی تمام معریٰ یا نیم معریٰ نظمیں میری قوتِ ناظمہ کا اعترافِ عجز ہیں۔ میں معریٰ نظم کہنے کے ارادے سے معریٰ نظم کہنا ایک غیر فنکارانہ اقدام سمجھتا ہوں۔ اس لئے میری ہر نظم کا آغاز پابندی کے ارادے سے ہوتا ہے مگر جب کبھی میں اپنی ذہنی الجھنوں اور موضوع کے مطالبات سے مجبور ہو جاتا ہوں تو اس کو معریٰ یا نیم معریٰ شکل میں پیش کرتا ہوں۔ مگر اس مجبوری میں بھی فن کے تقاضوں سے بے خبر نہیں ہوتا۔ ردیف، قافیہ اور بحر کی پابندیوں کو توڑنے کے بعد نظم میں جو ایک سپاٹ پن پیدا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے تو اس کمی کو ادب کے دوسرے فنی لوازمات سے پورا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ چنانچہ اگر آپ غور فرمائیں گے تو سننے میں آپ کو میری بہت سی معریٰ نظمیں پابند معلوم ہونگی اور آپ کو ان کی کرختگی کا احساس نہ ہوگا۔

یہ سب کچھ ہے مگر "جرس" کو اشاعت کے لئے نسیم صاحب کے حوالہ کرنے کے بعد میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ سب کا سب بھرپور نظم نہیں کر سکا ہوں تشنگی بدستور ہے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ابھی میں ارتقائی منازل سے گذر رہا ہوں۔ اضافہ کی بہت گنجائش ہے جو شاید اس دور میں پوری ہو۔

ماحول بھی اب تک وہی ہے۔ خیال تھا کہ جنگ ختم ہونے پر حالات سدھر جائیں گے، معاشی آسودگی اور اقتصادی آزادی ہوگی۔ مگر اب تو وہ بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ الجھن پر الجھن بڑھتی جا رہی ہے۔ سکون کا فقدان۔ قدم قدم پر رکاوٹیں نفس نفس پر بندشیں۔ دیکھنا ہے کہ آخر کب تک ہم کو ان سب مشکلات سے چھٹکارا ہوتا ہے۔ اب تو دم گھٹنے لگا ہے۔ مگر اپنی ذہنی اُفتاد کو کیا کریں۔ باوجود ان سب باتوں کے ایک امید کی کرن کبھی کبھی جھلک جاتی ہے۔ جی بھر کے محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اور ہمہ وقت سکون اور اقتصادی آسودگی کی تلاش ہے اِس وقت ہمارے اہم ترین موضوعات سخن یہی ہیں اور انہی میں ہماری زندگی کے خوشگوار ہونے کا راز ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے ؟

وامق احمد مجتبیٰ

اپریل سنہ ۱۹۵۰ء

بہ نامِ فکر

اس غمِ دوست نے کیا کچھ نہ ستم ڈھائے مگر
غمِ دوراں کی طرح جان سے مارا تو نہیں

سخنہائے گفتنی

مانا کہ حسنِ یار میں اب بھی وہی ہیں شوخیاں
مانا کہ نبضِ عشق میں دوڑ رہی ہیں بجلیاں
مانا کہ صحن باغ میں اب بھی بہار آتی ہے
اب بھی پپیہے کی صدا دشت میں تھرتھراتی ہے
لیکن ابھی تو سامنے زندگیوں کی لاش ہے
لوحِ جبین وقت پر کتنی بڑی خراش ہے
مانا رُخ گلاب میں اب بھی وہی ہیں نرمیاں
مانا شرارِ سنگ میں اب بھی وہی ہیں گرمیاں

مانا کہ آسماں پہ ہے تاروں کی انجمن وہی
مست گھٹا کی زلف سے کوندے کا بانکپن وہی
لیکن ابھی تو سامنے زندگیوں کی لاش ہے
شاعرِ عصر کا جگر چوٹوں سے پاش پاش ہے

مانا رباب و چنگ کے نغموں میں زیر و بم وہی
مانا کہ فیلسوف کے ہات میں ہے قلم وہی
مانا کہ جبر و قدر کا ٹوٹا نہیں طلسم راز
ذکر بہشت و فکر حور اب بھی بہت ہے دلنواز
لیکن ابھی تو سامنے زندگیوں کی لاش ہے
زخمی دل و دماغ کو مرہموں کی تلاش ہے

مانا کہ خاک و خون کے تذکرے ہیں گھناؤنے
مانا کہ انقلاب کے معرکے ہیں ڈراؤنے
آج بھی رنگ و بو کی وہ بھولی ہوئی کہانیاں
موقع ملے تو چھیڑ دیں ترسی ہوئی جوانیاں
لیکن ابھی تو سامنے زندگیوں کی لاش ہے
جذبۂ انتقام کی تیغ میں ارتعاش ہے

الّھڑ سپاہی

شمع کی لو میں اُبھر آئی ہیں ظلمت کی رگیں
بدلے لینے پہ ہے آمادہ پتنگوں کی قطار

کتنے الّھڑ یہ سپاہی ہیں کہ ڈرتے ہی نہیں
مرتے جاتے ہیں مگر ہیں کہ چلے آتے ہیں
جم کے میداں سے قدم ان کے اُکھڑتے ہی نہیں
زندگی کے نئے انداز بتا جاتے ہیں
آگ کو آگ سمجھتے نہیں ہٹتے ہی نہیں

اپنی لاشوں سے بنا دیتے ہیں شعلے کا مزار
تاکہ وہ نسلیں جو کل آئیں گی محفوظ رہیں

سوکھے ہوئے بیلے

تم نے سوکھے ہوئے بیلے بھی کبھی سونگھے ہیں
ان کو مسلا نہ کرو
کتنی آزردہ مگر بھینی مہک دیتے ہیں
ان کو پھینکا نہ کرو
گرد آلود بجھے چہروں کو سمجھا بھی کرو
صرف دیکھا نہ کرو
ہاتھ کے چھالوں کا گھٹنوں کا مداوا بھی کرو
صرف چھیڑا نہ کرو
تم نے سوکھے ہوئے بیلے بھی کبھی سونگھے ہیں

بنت المعاش

ہاں اُنھی ٹوٹے مکانوں میں ۔ اُنھی گلیوں میں
پھر سسکتے ہوئے ارمانوں کی ہے ارزانی
پھر ڈھلکنے لگیں آنکھوں سے دہکتی بوندیں
پھر کھٹکتے ہوئے تاروں پہ نظر جمنے لگی
ہاں اُنھی ٹوٹے مکانوں میں ۔ اُنھی گلیوں میں

پھر وہ پر دار فرشتہ نے کماں سیدھی کی
پھر اُسی شاہدِ مغموم سے ملتے جاکر

پھر ہوسناک محبت کی ہوا چلنے لگی
پھر درندوں نے پرے باندھے ہیں مُرداروں پر
ہاں اِنھی ٹوٹے مکانوں میں — اُنھی گلیوں میں

آہ یہ سردیوں کی رات — یہ سڑکوں پہ کُہر
پہریداروں کے وہ مشکوک قدم کی آہٹ
جیسے مزدور تھکے ہاتوں سے کوٹے کنکر
یا کراہے کوئی بیمار بدل کر کروٹ
ہاں اِنھی ٹوٹے مکانوں میں — اِنھی گلیوں میں

کیوں مری سانس یہ سینے میں دبی جاتی ہے
تالیاں بجتی ہیں — سناٹا ہے — اور کچھ بھی نہیں
ایک تصویر سی بن بن کے مِٹی جاتی ہے
جھوٹے سونے ہی کے آویزے مگر کتنے حسیں
ہاں اِنھی ٹوٹے مکانوں میں — اِنھی گلیوں میں

ایک سایہ سا اندھیرے میں ابھی لہرایا
جیسے تاریک فضاؤں میں کسی ریل کا دھواں

کس نے مانوس نگاہوں سے مجھے پھر دیکھا
سرد رخساروں پہ جلتے ہوئے اشکوں کے نشاں؟؟
آہ یہ سردیوں کی رات — یہ بھیگی پلکیں!
اب یہ دوکان اسی طرح لگا کرتی ہے
ہاں انھی ٹوٹے مکانوں میں — انھی گلیوں میں
معصیت بھوک کے سائے میں اُگا کرتی ہے

نغمہ۔ ادکھلائیں جمنا کے کنارے ایک رات

دُھندلا دُھندلا رات کا پیکر
اُس پہ روپہلی سی اک چادر
ڈھنکے ہوئے بادل سے فلک پر
کھیل رہے ہیں ماہ و اختر
جیسے موجیں مارے سمندر
دیکھ یہ کیف آگیں منظر
دل کچھ کہتا ہے رہ رہ کر
لیکن اُن کو اِس کی خبر کیا!

ایسے میں جمنا کے کنارے
ہوتے ہیں فطرت کے اشارے
اُٹھتی ہیں موجیں سینہ اُبھارے
آنچل میں لے کر مہپارے
کِشتِ دہقاں بال سنوارے
جلتی ہے دنیا جس کے سہارے
اک پردیسی اور یہ نظارے
لیکن اُن کو اِس کی خبر کیا!

بل کھاتا دریا کا دامن
بجتے ہوئے لہروں کے جھانجھن
جیسے کوئی متوالی جوگن
گائے اکتارے پر ساون
یا لہرائے ہار کے تن من
بین کی گت پر نیلی ناگن
بڑھ گئی دل کی اور بھی اُلجھن
لیکن اُن کو اِس کی خبر کیا!

کیا شے چھلکی جام سے باہر
پی جانے کی حد سے گذر کر
آنسو کی اک بوند پلک پر
ساری دنیا جس کے اندر
کانپ رہی ہے تھر تھر تھر تھر
ٹپکے کیسے سوکھے کیوں کر
یوں ہی راتیں کٹتی ہیں اکثر
لیکن اُن کو اس کی خبر کیا!

شرابی

مجھ کو کیا مطلب گھٹا سے اور کیا ایّامِ مے
صبح میری صبحِ مے ہے شام میری شامِ مے
یا مری دکھتی جوانی بن گئی پیغامِ مے
یہ نہیں تو کس لئے میں نے اٹھایا جامِ مے

سونی سونی سی نظر آتی ہے بزمِ کائنات
پھیکا ہوتا جا رہا ہے خود بخود رنگِ حیات
خوف ہے تھک کر نہ سو جائے مری بےچین رات
یہ نہیں تو کس لئے میں نے اٹھایا جامِ مے

دُھندلا دھندلا ملگجا سا ہے چراغِ زندگی
زرد پڑتا جا رہا ہے سبزہ باغِ زندگی
خشک آتا ہے نظر مجھ کو ایاغِ زندگی
یہ نہیں تو کس لئے میں نے اُٹھایا جامِ مے

غمزدہ کو مرکزِ غم کا پتہ ملتا نہیں
دائرے کو جیسے خود اس کا سرا ملتا نہیں
کیسے دل بہلے کوئی اپنے سوا ملتا نہیں
یہ نہیں تو کس لئے میں نے اُٹھایا جامِ مے

سرد پڑتا جا رہا ہے دل کا انگارہ کوئی
وہ فضا تھرّائی وہ ٹوٹا کہیں تارہ کوئی
یا مرے سینے پہ چل کر رُک گیا آرہ کوئی
یہ نہیں تو کس لئے میں نے اُٹھایا جامِ مے

آخرش یہ چند لمحے کیوں کروں برباد میں
غیر ممکن ساتھ اوروں کے رہوں ناشاد میں
کر رہا ہوں ایک نرالی زندگی ایجاد میں
یہ نہیں تو کس لئے میں نے اُٹھایا جامِ مے

زور بازو پر مرے چلتی ہے دنیا کی مشین

اور مری ہڈی پہ قائم ہے عروجِ خسروی

منتظر ہوں کب نگل جائے گی ان سب کو زمین

یہ نہیں تو کس لئے میں نے اُٹھایا جامِ مے

خسروی انداز سے مجھ پر ترحم کی نظر

کام کرتی ہے نمک پاشی کا میرے زخم پر

میری خودداری مگر اونچا کئے ہے میرا سر

یہ نہیں تو کس لئے میں نے اُٹھایا جامِ مے

کیوں ڈراتے ہیں مجھے یہ کجکلاہان زمین

خود بنے بیٹھے ہیں جو صدہا جرائم کے امین

خون سے ہے آج تک رنگین جنکی آستین

یہ نہیں تو کس لئے میں نے اُٹھایا جامِ مے

اِن سماجی کلفتوں کو میں اُٹھا سکتا نہیں

دامن تہذیب کے دھبے چھُپا سکتا نہیں

ہوش میں رہ کر میں اپنے کو بھلا سکتا نہیں

یہ نہیں تو کس لئے میں نے اُٹھایا جامِ مے

پی رہا ہوں یاس کا دیپک بجھانے کے لئے
پی رہا ہوں اک نیا لہرا سُنانے کے لئے
پی رہا ہوں سوتی دنیا کو جگانے کے لئے
یہ نہیں تو کس لئے میں نے اُٹھایا جامِ مے

پی رہا ہوں اپنی قوت آزمانے کے لئے
پی رہا ہوں نقشِ کہنہ کو مٹانے کے لئے
پی رہا ہوں تاش کے اِس گھر کو ڈھانیکے لئے
یہ نہیں تو کس لئے میں نے اُٹھایا جامِ مے

پنڈت و ملا سبھی کھو بیٹھے اپنا اعتبار
جس طرح شاہیں کے چنگل سے نکل جائے شکار
اس ریاکاری سے تو بہتر ہے میکش کا خمار
یہ نہیں تو کس لئے میں نے اُٹھایا جامِ مے

غم غلط کرتا ہوا بڑھتا چلا جاؤں گا میں
سینۂ شمشیر پر چڑھتا چلا جاؤں گا میں
اپنی رفعت کے رجز پڑھتا چلا جاؤں گا میں
یہ نہیں تو کس لئے میں نے اُٹھایا جامِ مے

سیکڑوں صدیوں کا ہے ہیجان سینے میں مرے
انگنت بدلوں کا ہے ارمان سینے میں مرے
کروٹیں لیتا ہے اک طوفان سینے میں مرے
یہ نہیں تو کس لئے میں نے اُٹھایا جام مے

عید

زباں پر عید کا نغمہ ہے دل مرجھایا جاتا ہے
لبوں پر ہے تبسم اور کلیجہ منہ کو آتا ہے
کہ ننگا ہے کسی کمبخت کا جسم آج کے دن بھی
کہیں دیبا و اطلس کا عمامہ جگمگاتا ہے

گلے ملنے کا ساماں اور یہ پائیں باغ کی سج دھج
یہاں عیش و مسرت کا سبق دوہرایا جاتا ہے
اُدھر اس اینڈ بیرا اس سمےج میں بیٹھا ہوا اک دہقاں
کہ دیکھے آج کی ڈالی میں کیا انعام پاتا ہے

کوئی دستِ حنائی میں لئے ہے تہنیت کا خط
کہیں ترسا ہوا اک ہات اُٹھ کر تھرا تا ہے
اُٹھائی ہے کسی نے خیر مقدم کے لئے چلمن
کسی کمسن کو آج اُس کا رنڈاپا کھائے جاتا ہے

کہیں تو قہقہوں سے چھت اُڑی جاتی ہے ایواں کی
کہیں اُمید کا ٹوٹا سا دیپک ٹمٹماتا ہے
یہ کیسی عید ہے اے دوست اس کو اور کچھ کہہ لے
کہ سنتے تھے ہلالِ عید رُوتوں کو ہنساتا ہے

پاپی

زندگی میں عشق سے بڑھ کر مراحل اور ہیں
اس زمانہ میں تمنّا اور ہے دل اور ہیں
میری دنیائے جنوں کے اب مشاغل اور ہیں
ایسی حالت میں بھی کیا مجھ سے محبت ہے تمھیں

اب تمہارا حُسن بھی میرے لئے بیکار ہے
اور تمہاری یاد بھی احساس پر اک بار ہے
کیونکہ میرا جذبۂ بے مائگی بیدار ہے
ایسی حالت میں بھی کیا مجھ سے محبت ہے تمھیں

کوئی ہمدم ہی نہیں میں حالِ دل کس سے کہوں
زندگی میں نزع کی یہ سختیاں کب تک سہوں
اک مسلسل کرب ہے جینا کہاں جا کر رہوں
ایسی حالت میں بھی کیا مجھ سے محبت ہے تمھیں

مدتوں کے دوست بھی اب مجھ سے کترانے لگے
دولت و عصمت کے ٹھیکیدار گھبرانے لگے
خوف سے دیو خرد کے پاؤں تھرانے لگے
ایسی حالت میں بھی کیا مجھ سے محبت ہے تمھیں

میرا سینہ اک جوالا ہے غمِ ایام سے
بھاگتا ہے میرا سایہ ڈر کے میرے نام سے
ہوتا ہے آغاز میرے نام کا دشنام سے
ایسی حالت میں بھی کیا مجھ سے محبت ہے تمھیں

کوئی دیوانہ کوئی ناکارہ کہتا ہے مجھے
کوئی پاپی اور کوئی آوارہ کہتا ہے مجھے
اور ترس کھا کر کوئی بیچارہ کہتا ہے مجھے
ایسی حالت میں بھی کیا مجھ سے محبت ہے تمھیں

دیو بن کر کھائے جاتا ہے مجھے میرا خیال
اور وجودِ ظاہری میرا ہے خود مجھ پر وبال
موت کتنی دُور ہے اور زندگی کتنی محال
ایسی حالت میں بھی کیا مجھ سے محبت ہے تمھیں

باوجود اس تلخ کامی کے بھی جینا ہے مجھے
زندگی کا دامنِ صد چاک سینا ہے مجھے
اس زمانے کی روش کا خون پینا ہے مجھے
ایسی حالت میں بھی کیا مجھ سے محبت ہے تمھیں

جی میں آتا ہے کہ قانونی حدوں کو توڑ دوں
طاقِ زندانِ تمدّن کی سلاخیں موڑ دوں
شیشۂ مذہب کو سنگِ معصیت سے پھوڑ دوں
ایسی حالت میں بھی کیا مجھ سے محبت ہے تمھیں

جگمگاتے شیش محلوں پر نظر جاتی ہے جب
جاگ اُٹھتے ہیں مرے خوابیدہ ارماں سب کے سب
باندھ کر مُٹھی چبا لیتا ہوں میں دانتوں سے لب
ایسی حالت میں بھی کیا مجھ سے محبت ہے تمھیں

دھوتیں دیتی ہیں مجھ کو رات کی تاریکیاں
راہ کو روشن بناتی ہیں مری مجبوریاں
ابر کے پردوں میں جیسے کوندتی ہیں بجلیاں
ایسی حالت میں بھی کیا مجھ سے محبت ہے تمھیں

جُرم کی پریوں نے میرے سر پہ رکھا ہے وہ تاج
جس نے میری فطرتِ مجروح کو بخشی ہے لاج
انتقام آلود جذبوں سے میں لیتا ہوں خراج
ایسی حالت میں بھی کیا مجھ سے محبت ہے تمھیں

چاندنی آتی بھی ہے تو آنکھ دکھلاتی ہوئی
میری امیدوں پہ غم کی چھاؤنی چھاتی ہوئی
یا مرے ذوقِ گنہ پر آگ برساتی ہوئی
ایسی حالت میں بھی کیا مجھ سے محبت ہے تمھیں

دن کو اب چھپ کر کسی گوشہ میں پڑ رہتا ہوں میں
دور آبادی سے ہٹ کر راستہ چلتا ہوں میں
آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر ڈرتا ہوں میں
ایسی حالت میں بھی کیا مجھ سے محبت ہے تمھیں

مجھ کو اب فرصت کہاں تم سے محبت کر سکوں
یا کبھی بہرِ سکوں شرح حقیقت کر سکوں
یا تمہاری نازشوں کی کچھ اعانت کر سکوں
ایسی حالت میں بھی کیا مجھ سے محبت ہے تمھیں

دیکھتا ہو گا بھلا اب کون چہرے کی دمک
دیکھ کر اب کس کو بڑھتی ہو گی آنکھوں کی چمک
میں نے ہی ۔ ہاں ۔ چھین لی تم سے شبستاں کی مہک
ایسی حالت میں بھی کیا مجھ سے محبت ہے تمھیں

اپنی تصویر سے

اے مرے ماضی کے خاموش نگارِ رنگیں
کیوں مجھے دیکھ کے اس درجہ تجھے حیرت ہے
ٹکٹکی باندھے ہوئے تھک گئی ہونگی آنکھیں
فکر و احساس سے خالی ہے مگر تیری جبیں
اے مرے ماضی کے خاموش نگارِ رنگیں

تجھ کو حاصل ہے سکوں موت کا اک دوسرا نام
خامشی میں تری مضمر ہے وہ تاریک جمود
جس کی فرہنگ میں ہے اک لفظ غلط
اور مرا ذوقِ عمل زیست کا انتھک پیغام
تجھ کو حاصل ہے سکوں موت کا اک دوسرا نام

کتنے پژمردہ ہیں یہ تیرے گلابی رُخسار
جیسے مرگھٹ میں بھڑکتے ہوں چتا کے شعلے
مگر ان شعلوں میں ملتے نہیں آثارِ حیات
اور مرے کانپتے ڈھانچے میں غرورِ رفتار
کتنے پژمردہ ہیں یہ تیرے گلابی رُخسار

اے کتاب غمِ اجداد کے پارینہ ورق
تیرے سینے میں نہیں زلزلہ پیرا دہ آنی
جس نے تعمیرِ عناصر کو ہلا رکھا ہے
اور اگر حد سے بڑھے لوٹ دے عالم کا طبق
اے کتاب غمِ اجداد کے پارینہ ورق

ہاں میں اب وہ نہیں ڈھونڈے ہے جسے تیری نظر
گرسنہ نظریں مری اور یہ پیلے رُخسار
وقت کے ساتھ بدلتے ہی چلے جائیں گے
اتنا بدلیں گے کہ ہو جائیں گے سب خاکستر
ہاں میں اب وہ نہیں ڈھونڈے ہے جسے تیری نظر

تو بھی بلور کو اب توڑ کے باہر آجا
حرف روزن سے اشاروں کا تو یہ وقت نہیں

پھونکدے پھونکدے اس کاغذی پیراہن کو
نقش فریاد میں اب شوخیٔ گفتار دکھا
توبھی بلّور کو اب توڑکے باہر آجا

ہو چکا صبر و قناعت کا پیالہ لبریز
وقت کی سانس بھی اب ٹوٹنے ہی والی ہے
تھک کے رہ جائے گا یہ ڈاکوؤں کا جمِ غفیر
گردنیں جھک گئیں رہواروں کی شل ہے مہمیز
ہو چکا صبر و قناعت کا پیالہ لبریز

توڑدے توڑدے پابندیٔ قرطاسِ کہن
توڑدے توڑدے اس شیش محل کی دیوار
قصرِ فولاد کی چوکھٹ سے نکل آ باہر
زنگ آلود نظر آتا ہے ہر بند رسن
توڑدے توڑدے اس قید کی تعمیرِ کہن
اے مرے ماضی کے خاموش نگارِ رنگیں

اُس پار

یہ روئی ہے شبنم تربت پر یا اپنا ہی بھیگا دامن ہے
آہٹ ہے کسی کے پیروں کی یا اپنے ہی دل کی دھڑکن ہے
اِن ٹوٹی ہوئی زنجیروں کے میں کب تک جوڑ ملاؤں گا
اُس پار مجھے جانے بھی دو روکو نہ مجھے میں جاؤں گا

فطرت کی سنہری پیشانی سے چاند کی بندی چھوٹ گئی
آکاش کی سیمیں گردن سے تاروں کی لڑی بھی ٹوٹ گئی
اُلفت کی سہانی رات کہاں اب اور ترانے گاؤں گا
اُس پار مجھے جانے بھی دو روکو نہ مجھے میں جاؤں گا

دیکھو تو افق کے سنگم سے وہ کون بلاتا ہے مجھکو
کس درجہ مگن، کس درجہ حسیں آواز سناتا ہے مجھکو
آزاد فضا کا دیوتا ہے اُس کو بھی یہاں لے آؤں گا
اُس پار مجھے جانے بھی دو روکو نہ مجھے میں جاؤں گا

ان ہیرے ایسے اشکوں کو عارض پہ لُنڈھا کر مت روکو
یاقوت کے ایسے ہونٹوں کو دانتوں سے چبا کر مت روکو
اک بات ہے جو رہ جائے گی یہ وقت کہاں پھر پاؤں گا
اُس پار مجھے جانے بھی دو روکو نہ مجھے میں جاؤں گا

یہ ٹوٹی ہوئی بنسی اپنی میں تم کو سونپے جاتا ہوں
اس میری امانت کو رکھو میں جا کے ابھی لوٹ آتا ہوں
تب وقت کے لمحے لمحے سے نغمات نئے برساؤں گا
اُس پار مجھے جانے بھی دو روکو نہ مجھے میں جاؤں گا

خونخوار نگاہوں کے ڈر سے لب تک نہ ہلیں یہ کیا معنی
تقدیر کی بھولی باتوں کو ہم سُنتے رہیں یہ کیا معنی

صدیوں کے بھیانک ماضی کی ان قندیلوں کو بجھاؤں گا
اُس پار مجھے جانے بھی دو روکو نہ مجھے میں جاؤں گا

کب تک یہ زمانے کی دیوی آرام محل میں سوئے گی
اور اُس کے بے حس قدموں پر کب تک یہ جوانی روئے گی
اور ہات پہ اپنے ہات دھرے کب تک میں یونہی پچھتاؤں گا
اُس پار مجھے جانے بھی دو روکو نہ مجھے میں جاؤں گا

کب تک یہ عمامہ کفر و دین کے ڈھونگ رچائے جائے گا
کب تک یہ بچاری دنیا کو انگلی پہ نچائے جائے گا
ان جھگڑوں سے جو پاک رہے وہ بستی ایک بساؤں گا
اُس پار مجھے جانے بھی دو روکو نہ مجھے میں جاؤں گا

ایسا بھی زمانہ آئے گا جب ہم دونوں مل جائیں گے
ہر منظر کیف آگیں ہوگا، ہر کیف پہ ہم لہرائیں گے
دنیا ہی نرالی پاؤ گی جس وقت میں واپس آؤں گا
اُس پار مجھے جانے بھی دو روکو نہ مجھے میں جاؤں گا

یہ صبح جو پھیکی پھیکی ہے فردوس نظر بن جائے گی
بوتل جو یہ خالی خالی ہے شہنازِ سحر بن جائے گی
رومان صفت آزاد نفس اک دورِ زمانہ لاؤں گا
اُس پار مجھے جانے بھی دو روکو نہ مجھے میں جاؤں گا

زویا۔ تانیا

آج پھر فتنۂ افرنگ کی ڈھلتی ہوئی شام
اپنی تاریکیوں میں آپ دبی جاتی ہے
اور فاشست درندوں کو اشارے دے کر
اپنی ہی موت کا گہوارہ بنی جاتی ہے
مگر اک احمریں دوشیزہ جری قرۃ العین
اپنی تہذیب و تمدّن کی قسم کھاتی ہوئی
انتقامانہ تحفّظ کی جلا کر مشعل
موت کے منہ میں چلی جاتی ہے دراتی ہوئی

کوہ قفقاز کی برفیلی ہواؤں سے کہو
اس جواں خون کے معصوم شرارے لے کر
بربریت کی کمیں گاہوں پہ شعلے برسائیں
تھک کے بیٹھے ہوئے شاہیں کے جلا دیں شہپر

(یہ نظم میں نے سوویٹ روس کی ایک اٹھارہ سالہ لڑکی 'زویا' کے اُن کارناموں اور قربانیوں سے متاثر ہو کر لکھی تھی جو اس دخترِ روس نے فاشیت کے خلاف اپنے وطن کی قربان گاہِ حُریت پر پیش کیں۔ وامق)

ماضی کی آخری ہچکی

وہ مضمحل نمودِ شب کی دُھندلی دُھندلی روشنی
کھلی ہوئی دیارِ شوق میں وہ مکر چاندنی
خیال شربتِ وصال سے چھلک رہے تھے دل
تصورات سرد سے جبینِ شاعری خجل
یہ زندگی تو کچھ نہیں، اسی خیال میں مگن
ولیؔ و میرؔ کی زباں کا ترجمان ہر سخن
روایتوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی ہر اک نظر
حقیقتوں کی تلخیوں سے ذہن و فکر بے خبر

سخن طراز محفلوں میں عاشقی کا زور تھا
ہر ایک لب پہ حُسن و زلف و رنگ و بو کا شور تھا
زباں کو لطفِ عارضی کی چاشنی سے کام تھا
توہماتِ کور، کا مشاہدات نام تھا
ذرا نگاہ بند کی فضا میں تیرنے لگے
فضا سے اُٹھ کے نہر کہکشاں میں پیرنے لگے
فلک پہ محوِ سیر تھے کہ دل سے اک دھواں اُٹھا
کھُلی جو آنکھ خواب سے تو سامنے یہ حشر تھا
کہ زندگی کی چیخ سے زمیں کا رنگ زرد ہے
بگولے اور آندھیوں سے زلیست گرد برد ہے
اُچھل رہا ہے کب سے بزمِ کائنات میں لہو
مچی ہے لُوٹ ہر طرف لگی ہے آگ چار سُو
پرِ خیال جل اُٹھے حقیقتوں کی آنچ سے
جہاں سے ہم تھے بے خبر اُسی جہاں میں آگئے
تعیشِ دماغ، کی فریب کاری کھُل گئی
طلسمِ شب کو توڑ کر سحر ہوئی سحر ہوئی!

رات کے دو بجے

کتنی سنسان سڑک کتنا بھیانک منظر

سب کے سب مر گئے کیا شہر کے رہنے والے

راکھ کے ڈھیروں میں کتوں نے بھی دم سادھ لیے

بھونکتے بھونکتے کمبخت کدھر ڈوب گئے

کیا خبر ساتھ تلنگوں کے پڑے سوتے ہوں

کوئی آہٹ۔ کوئی آواز۔ کوئی چیخ پکار

آج ناقوس بھی ہاتوں میں پجاری کے نہیں

کوئی پتہ ہی کھڑک جائے تو چین آ جائے

کوئی طائر ہی پھڑک جائے تو چین آ جائے

کبھی گھبرا کے اگر تیز اُٹھاتا ہوں قدم
کٹکٹاتے ہوئے جھینگر بھی سمٹ جاتے ہیں
اس پہ یہ قمقموں کی زرد چمکتی جھالر
اِسی بے کیفی سے تا صبح جلے جائے گی
(بے جھپک آنکھوں میں بے رنگ تمدّن کا غبار)
جیسے راتوں کو کسی ٹوٹے سے ویرانے میں
دیدے پھاڑے ہوئے بھوتوں کی ہو دور و یہ قطار

آسماں پر یہ ستاروں کے دیے ہی اچھے
ٹمٹماتے بھی ہیں ہلتے بھی ہیں بجھتے بھی ہیں
ٹوٹ کر جن کے بھبھوکے سے سلگتے رخسار
دل میں اُمید کی زنجیر ہلاتے آ ہیں

چاند بڑھتا بھی ہے گھٹتا بھی ہے ڈھلتا بھی ہے
اپنے بے سود تلوّن پہ کبھی شرما کر
کسی تاریک پہاڑی میں سما جاتا ہے
مگر ان برقی چراغوں میں کوئی نور نہیں
ان کے سینوں ہی میں شاید کوئی ناسور نہیں

دل تو کہتا ہے انھیں توڑ دوں اک اک کرکے
کوئی آہٹ — کوئی آواز — کوئی شور تو ہو
اس سے بہتر تو وہی تھا مرا تنہا بستر
کروٹیں لینے میں چوبوں کی وہ شکوہ سنجی
خستہ کاندھوں پہ گراں بوجھ کی فریاد سہی
کچھ تو تنہائی کا احساس دبا دیتی تھی
لیکن اب فکر ہی کیا چند گھڑی — اور سحر
کتنی سنسان سڑک، کتنا بھیانک منظر

آنکھ لگتے ہی......؟

اک نئے دور کا آغاز ہوا چاہتا ہے
زندگی کا درِ مسدود کھلا چاہتا ہے
ہنس کے رخصت بھی کرو دیکھو وہ شیپور بجے
وہ گرجنے لگیں توپیں وہ پرے بڑھنے لگے
وہ زمیں کھدنے لگی ٹاپوں سے رہواروں کی
وہ فضا ہلنے لگی گونج سے طیاروں کی
بیڑیاں گلنے لگیں طوقِ گراں کٹنے لگے
ابر مدّت سے جو چھائے ہوئے تھے چھٹنے لگے

چڑھائی

اُس لگائے بوڑھے بچے آگے پیچھے دوڑ رہے ہیں
ایسے بھی ہیں جو راہ میں حائل سخت چٹانیں توڑ رہے ہیں
آشاؤں کے جنگل جنگل
دُور بہت ہی دور یہاں سے
کب کے چلے ہیں اور یہ چڑھائی
پَو پھٹتے ہی ہیرا اُٹھے تھے
تھک کر سایہ ڈھونڈ رہے ہیں ٹوٹی سانسیں جوڑ رہے ہیں
اونچی چوٹی اونچے ترانے کاندھے اب نہ جھکنے پائیں

ایسے تو دن رات بگولے
راہ میں اُٹھا ہی کرتے ہیں
آپس میں ٹکرا ٹکرا کر
نیلی فضا میں کھو جاتے ہیں
تن ہارے تو ہارے راہی من کے پاؤں نہ تھکنے پائیں
سائے بھی لمبے ہو ہو کر بربت کا منھ چوم رہے ہیں
سورج بھی اب خون اُگل کر
کالے کفن میں چھپ جائے گا
دھرتی کی چھاتی دہلے گی
لاشوں کا انبار لگے گا
دائیں بائیں کھڈ منھ کھولے بھوت کھڑے ہیں دیو کھڑے ہیں
رات اندھیری پاکھ سے پہلے ختم سفر کی بات ہے پکی
دن کے دن ہی منزل چھو لے
پورب پچھم جوڑ لگے ہیں
بھوکے پیاسے بوجھ اُٹھائے
بھاگ رہے ہیں ہانپ رہے ہیں
اب کے ہی تو اس جیون کو مزدوری منھ مانگ ملیگی
آس لگائے بوڑھے بچے آگے پیچھے دوڑ رہے ہیں

الف لیلہ

تھک گئی رات مسکنے لگا غازہ کا فسوں
سرد پڑنے لگیں گردن میں حمائل باہیں
فرش بستر پہ بکھرنے لگے افشاں کے چراغ
مضمحل سی نظر آنے لگیں عشرت گاہیں
زندگی کتنے ہی ویرانوں میں دم توڑ چکی
اب بھی ملتی ہیں مگر غم کی فسردہ راہیں
جس طرح طاق میں جل بجھتی ہیں شمعوں کی قطار
ظلمتِ شب میں جگاتی ہوئی کاشانوں کو
بن کے رہ جاتی ہے تا صبح پتنگوں کا مزار

خون کے حرفوں میں تحریر ہے دیواروں پر
اِن گھسٹتے ہوئے اجسام کے انباروں میں
درد کے رُخ کو پلٹ دینے کا مقدور نہیں
فکر گھبرائی ہوئی پھرتی ہے بازاروں میں
عمر اک سیلِ عفونت ہے بدر رو کی مثال
زیست اک چہ بچہ سڑتا ہوا گندلا پانی
جس سے سیراب ہوا کرتے ہیں خنزیر و شغال
وقت کی جلتی ہوئی راکھ سے جھلسے ہوئے پاؤں
آرزوؤں کی گھنی چھاؤں میں بیٹھے ہوئے دل
کربِ ماضی کے گراں بوجھ سے ڈوبی نبضیں
لاکھ چاہیں پہ اُبھرنے کا گماں لاحاصل
ایک موہوم سی حسرت میں جیئے جاتے ہیں
نام ہی نام مسرّت کا لئے جاتے ہیں
اپنی بے خواب تمنّا کا فسانہ ہے یہی
کل کی شب اور نئی اور نئی شب ہوگی
زندگی ہوگی نئی اور کہانی بھی نئی
صبر اے دوست کہ ظلمت کی گھڑی بیت گئی
تھک گئی رات مسلنے لگا غازہ کا فسوں
سرد پڑنے لگیں گردن میں حمائل بانہیں

اِرادہ

آج کی شب خرد سے جنگ رہے　　غم نہ خواب و خیال ننگ رہے
مطربِ خوشنوا کو دو آواز　　جام ٹکرائیں جلترنگ رہے
عمرِ رفتہ کا ذکر ہی کیا جب　　فکر فردا کی عقل دنگ رہے
آج کی شب یہاں سے ٹل نہ سکوں　　دو قدم چاہوں بھی تو چل نہ سکوں
اور دے اور دے انڈیل دے سب　　ایسا بہکوں کہ پھر سنبھل نہ سکوں

ڈگمگانے میں لطف ہے اے دوست
کھو کے پانے میں لطف ہے اے دوست

شامے چہ شامے

پھر وہی گذری ہوئی شام کہاں سے لاؤں

جس میں ہے دفن دہکتی ہوئی اُلفت کی کرن

جس میں موہوم سا اک چاند نظر آیا تھا

جس میں افکار کا صد چاک ہوا تھا دامن

جس میں کچھ دیر کو دل میں نے بھی بہلایا تھا

حاصل زیست وہ ہنگام کہاں سے لاؤں

پھر وہی گذری ہوئی شام کہاں سے لاؤں

پیکرِ فکر ذرا نکھا لیکہ کچھ اور ہے اب

لیکن اس دل میں کوئی چور ابھی پاتا ہوں

سُرمہ آلود فضاؤں سے اُبلتی ہوئی شب
آج بھی یاد ہے جس کی میں تڑپ جاتا ہوں
عہد رفتہ کا وہ انجام کہاں سے لاؤں
پھر وہی گذری ہوئی شام کہاں سے لاؤں

پھر اُٹھی آنکھوں میں رقصاں ہو تبسم کی پری
پھر وہ آنچل کا سرا اور وہ دستِ رنگیں
اپنے ماحول سے ہر چیز کو ہو بے خبری
نغمہ و کیف میں اُلجھا ہوا اک جسم حسیں
تشکلِ انسان میں وہ جام کہاں سے لاؤں
پھر وہی گذری ہوئی شام کہاں سے لاؤں

غور سے دیکھ رہی تھی مجھے چشم پروین
میگساری پہ ترے کانپ رہے تھے انجم
تمتما اُٹھی تھی غصہ سے ثریا کی جبیں
ساغر و چنگ کے نغمات میں افلاک تھے گم
ویسی ہی محفلِ خیام کہاں سے لاؤں
پھر وہی گذری ہوئی شام کہاں سے لاؤں

روزن کی آڑ سے

مری جلیس ___ مری زندگی کا سرمایہ
مرے قریب چلی آ ___ قریب اتنا قریب
کہ تجھ سے دور ___ ترے گوشواروں کے آگے
مری دبی ہوئی آواز کوئی سُن نہ سکے
اُس ایک راز کا محرم تجھے بنانا ہے
وہ راز جس میں چھپی ہے دل و زباں کی تپش
وہ راز جس میں ہے پوشیدہ زندگی کی خلش
وہ راز جس میں بھڑکتے ہیں فکر کے شعلے
وہ راز جس میں ارادوں کے جال بنتے ہیں
اُس ایک راز کا محرم تجھے بنانا ہے

وہی کہ جس میں دہکتا ہے سایہ زیرِ شجر
وہی کہ جس میں سلگتی ہے رات کی خنکی
وہ جس نے کر دیئے مفلوج رات کے شہپر
وہ جس نے تیری نظر کے فسوں کو چھین لیا
خلا کا نور زمیں کے سکوں کو چھین لیا

اُس ایک راز کا محرم تجھے بنانا ہے
وہ راز جس کا جفاکش نظام حامل ہے
وہ راز جس میں جوانی کا خون شامل ہے
وہ راز جس پہ ہے عفریتِ وقت کا پہرا
وہ راز جس کا سُنانا ہے آج سخت گناہ
یہ بات اور ہے ہر شخص جس سے ہے آگاہ

وہی وہی مری جان راز تجھ سے کہنا ہے
سُنیں سُنا کریں — گونگے ہیں یہ در و دیوار
وہ قید کیسے ہو، جو چیز ہے ہوا پہ سوار

یہ گشت زادیہ سوئے کھنڈر یہ ویرانے
صدائے بوم ہے جو کانپ اُٹھتے ہیں اکثر

جہاں مگس کے لیے عنکبوت کی فوجیں
بچھائے جال پڑا کرتی ہیں اِدھر سے اُدھر
یہ خالی جیبوں سے مغموم بیکراں مخلوق
یہ راستہ جسے ٹاپوں نے روند ڈالا ہے
چراغ جن میں پسینوں کا تیل جلتا ہے
کبھی جلے کبھی خاموش ہیں کہ جل نہ سکے
یہ خستہ حال مسافر تلاشِ منزل میں
یہ جسم جس میں ابھی تھوڑی جان باقی ہے
حیاتِ تازہ کا دل میں گمان باقی ہے
یہ سب کے سب ہی تو واقف ہیں اس فسانے سے
اُس ایک وقت سے جو آئے گا کبھی نہ کبھی
تو پھر یہ کس لئے لرزاں ہیں دست و پا میرے
یہ بندشیں یہ ہمارے قاعدوں کی پوٹ کی پوٹ
ہمارے ایسے ہی انسان کے بنائے ہوئے
مگر خلوص سے بیگانہ اجنبی صورت
نگار خانوں کو مسحور کر نہیں سکتی
بس ایک قہقہے ہیں جس کے موت کی قیمت

وہ دیو زہر کا پیالہ لئے کھڑا ہے تو کیا

سنیں سُنا کریں یہ راہ گیر بے چارے
سُنے سُنا کرے گوشِ زمیں ہماری بات
زباں پہ آتے ہی ہو جاتی ہے پرائی بات
تو پھر یہ کس لئے سہمی نظر ڈرے ہوئے ہونٹ
یہ کون چُھپ گیا روزن کی آڑ لیکے ابھی
یہ گُربہ پا ہی نہیں مارِ آستیں ہے کوئی

قریب آ مری مونس قریب اور قریب
کہ تجھ سے دور ترے گوشواروں کے آگے
مری دبی ہوئی آواز کوئی سُن نہ سکے
وہ بات جس کو سنانے کو روح تھی بے چین
اگر کہوں بھی تو اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں
زبانِ شمع پہ لَو کے علاوہ کچھ بھی نہیں

فرار؟

ریگ ساحل سے جو اُٹھتی ہے بگولہ بن کر
اپنی دوشیزگی و رقص کا طوفان لئے
سرنگوں ہو کے کسی دشت سے جا ملتی ہے
راہ میں نقشِ قدم روپ بدل دیتے ہیں
کس لئے شام و سحر رہتے ہیں سرگرمِ خرام
نہ کبھی دیکھتے ہیں مُڑ کے نہ تھکتے ہیں کبھی
ایسے بیکار سوالات میں کیا رکھا ہے
چاند کو چھونے کی بے سود تمنائے حسیں
ایک طفلانہ تجسُس کے سوا کچھ بھی نہیں

شعلۂ فکر میں جلتی ہوئی نبضوں کی پکار
ہات پھیلائے ہوئے تنگیٔ زنداں سے نڈھال
(بے حسی! تیرے سوا کوئی نہیں جائے فرار
تو نے بخشا ہے ابوالہول کو صدیوں کا جمود
تجھ سے وابستہ ہے خوابیدہ چٹانوں کا قرار
کتنی آسودہ و بے ہوش ہے تیری آغوش
جس طرح یخ کے پہاڑوں میں ہوائیں خاموش)
کاش ہو جاتے یونہی سرد یہ انگارے بھی!

کس لئے چیخ رہے ہیں یہ بھکاری بالک
کتوں کے جبڑوں میں روٹی پہ جھپٹتے ہوئے ہات
خاک میں لتھڑی ہوئی لاش پہ یہ جمِ غفیر
دستِ جلاد پہ اک خون کی بھدّی سی لکیر
پانی پانی ہوا جاتا ہے مصوّر کا قلم

تندِ احساس میں جکڑی ہوئی روحوں کی پکار
ایک زنجیر حسیں ایک طلائی حلقہ

دشمنِ جاں نظر آنے لگا یہ بازیچہ
سنگ و آہن پہ اُبھر آئے لہو کے قطرے
گھاؤ پھٹنے لگے۔ بہنے لگے۔ ناسور ہوئے

میرے احساس کی خوش رنگ طلائی زنجیر
ایک دو جرعوں میں تیزاب کے گلتی ہے کہیں
میل کٹ جائے گی کچھ اور نکھر جائے گا رنگ
پیچ در پیچ خلش پہلے سے بڑھ جائے گی
اور میں چِلّاتا ہی رہ جاؤں گا جرعے جرعے
تلخیٔ فکر سے بڑھ کر نہیں مے کی تلخی
غرق ہو جاؤں تو جذبات بھی سو جائیں گے
بے حسی چھائے گی زنجیر بھی گل جائے گی
چند گام اور ابھی چلنے کا ارماں ہے مجھے

مینا بازار

مناروں پر اذاں ہوئی
یہ شام بھی کہاں ہوئی
پجاری مندروں میں آ کے سنکھ پھونکنے لگے
یہ شام بھی کہاں ہوئی
گجر بجا ــــ بٹن دبے
وہ قمقمے چمک اُٹھے
دُکانیں جگمگا گئیں
نگاہوں میں سما گئیں

وہ مہوشانِ سیم بر
فسوں طرازِ رہ گزر
دَرُوں میں اپنے آ گئیں
اور اپنی کائناتِ غم پہ خود ہی جیسے چھا گئیں
لبِ خموش میں نئی کہانیاں لئے ہوئے
رُخوں پہ غازوں سے لدی جوانیاں لئے ہوئے
تپے ہوئے دماغ و دل میں کتنے شعلے مشتعل
یہ وہ خزاں رسیدہ ہیں۔ بہار جن سے منفعل
زمانے کے سلوک سے
یہ تنگ آ کے بھوک سے
رگڑ رہی ہیں ایڑیاں
مذلتوں کے غار میں
اور انتقام کے لئے
کھڑی ہیں انتظار میں
سماج کی یہ بیٹیاں
سماج ہی کی بیویاں
نظر کے تیز بھالوں سے
شراب کے پیالوں سے

فرشتوں سے شریف تر
زمیں کے رہنے والوں سے
خراجِ حُسن پائیں گی
ہنسیں گی اور ہنسائیں گی
یہ وہ ہیں جن کی زندگی
مسرتوں سے دور ہے
یہ وہ ہیں جن کی ہر ہنسی
جراحتوں سے چور ہے
یہ وہ ہیں جن کا گھر بلندیوں پہ رہ کے پست ہے
یہ وہ ہیں جن کی فتح بھی شکست ہی شکست ہے
مگر اِنھی پہ سنگ ساریوں کا حکم عام ہے
"وجود ہیں یہ کب سے اور کس طرح سے آگئیں"
جواب اس کا پھر ملے گا یہ تو وقت شام ہے
تھکے ہوئے نظام کی یہ شام بھی کہاں ہوئی
چلو اب آگے بڑھ چلیں
یہاں ٹھہر کے کیا کریں

ہمارے، ہم سفر نہ جانے کس طرف چلے گئے
اکیلا، ہم کو چھوڑ کر
مگر دلِ حزیں ٹھہر
وہ سامنے دوراہے پر
یہ کیسا ازدحام ہے
یہ کیسا انتظام ہے
یہ بادپا سواریوں پہ کیسا اہتمام ہے
عروسی دھوم دھام ہے
یہ بے بسی کی رخصتی
اُجالے میں یہ تیرگی
صدائے نَے سے کس کی ہر فغاں لپٹ کے رہ گئی
یہ شام بھی کہاں ہوئی
ابھی ابھی جوان سال
ایک زندہ لاش کو
حریر میں لپیٹ کر
مسرتوں کے دوش پر
کسی طلائی کہنہ سال مقبرے کو سونپنے

یہ لوگ لیک کے جائیں گے
اور اس کے بعد ہو گا کیا
یہ لوگ بھول جائیں گے
کسی نے غیظ میں کہا
"یہ کون بدشگون ہے
زبان اس کی کھینچ لو
غریبِ شہر ہو کوئی
تو شہر سے نکال دو"
اُدھر نگاہِ اہرمن
حویلیوں پہ خندہ زن
اِدھر سوادِ وقت پر
اُمید و بیم کی کرن
تھکے ہوئے نظام کی یہ شام بھی کہاں ہوئی
چلو اب آگے بڑھ چلیں
یہاں ٹھہر کے کیا کریں
ہمارے ہم سفر نہ جانے کس طرف چلے گئے
اکیلا ہم کو چھوڑ کر

کدھر سے آگیا کدھر
یہ تنگ و تار راستے
مگر یہ کس کی چیخ پر
قدم ہمارے رُک گئے
کسی نہان خانے کا لٹا ہوا شباب ہے
کہ ہات میں سماج کے شکستہ اک رباب ہے
مغنّیوں کو دو خبر
کہ اس کے تار تار میں
دبے ہوئے شرار ہیں
نہ جانے کون راگ ہے
نہ جانے کتنی آگ ہے
مگر یہ کس کے واسطے
یہ تنگ و تار راستے
صداؤں پر صدائیں دیں
یہاں تو اب کوئی نہیں
بس اک چراغ جھلملا رہا تھا وہ بھی بجھ گیا
مژہ لرز کے رہ گئی

اور اک نگاہِ واپسیں
فسانے کتنے کہہ گئی
چتا بھی خاک ہو چکی
جوانی خون رو چکی
یہ کون شے دبے قدم ٹھٹک کے دور ہٹ گئی
درندے چڑھتے آرہے ہیں مرگھٹوں کی راہ میں
سیاہی بڑھتی جا رہی ہے فکر کی نگاہ میں
یہ مختصر سی داستاں
اور اس میں اتنی تلخیاں
طلوع شب میں الاماں
یہ آدھی رات کا سماں
تھکے ہوئے نظام کی یہ شام بھی کہاں ہوئی
چلو اب آگے بڑھ چلیں
یہاں ٹھہر کے کیا کریں
ہمارے ہم سفر نہ جانے کس طرف چلے گئے
اکیلا ہم کو چھوڑ کر

راہگیر

دور تک ریگ کا تپتا میداں
سینۂ ارض — حوادث کا مزار
جس میں خوابیدہ ہیں کتنے طوفاں
پنجر کے ٹوٹے پڑے مرداروں کے
بھٹکے بھٹکے ہوئے ٹاپوں کے نشاں
سر جھکائے ہوئے بیٹھا ہے کوئی
دل میں اُمیدوں کا اک نخلستاں

نوٹ :- ایک نوجوان سیاسی شاعر کی حالت دیکھ کر

راستہ بھول گیا ہے شاید
آنکھیں نمناک ہیں اور خشک نمے باں
تیری ٹھوکر میں بڑا کس بل ہے
تجھ کو معلوم نہیں اے ناداں
تو جو چاہے تو اسی بنجر سے
کتنے چشمے ابھی ہو جائیں رواں
پھوٹنے ہی کو ہے رگ رگ سے لہو
سُرخ ہونے ہی کو ہے ریگستاں

جاڑے کی چاندنی

یہ ماہتاب یہ سمٹا ہوا شبابِ فلک
کہ جیسے نور کا تالاب منجمد ہو جائے
ہوا کے دوش پہ اڑتی ہوئی یہ چادرِ یخ
پگھل پگھل کے بھگوتی رہے گی دامنِ شب
یہ آسمان ہے یا ایک کاسۂ برف آب
محیط ارض تلاطم خموشیوں کا لئے
مہک رہی ہے کہیں دور رات کی رانی
مدھر سُروں میں گرے جیسے جھرنوں کا پانی

ٹپک رہی ہے کہیں نوک برگ سے شبنم
ستم ظریفیٔ عالم پہ گریۂ پیہم

بدن کو اپنے سمیٹے ہوئے کدھر اے دوست
بہت حسیں بہت ہی حسین ہے وہ مگر
یہ کچھ ضرور نہیں تیرے واسطے وہ بھی
جلائے بیٹھی ہو سینے میں شمع بیتابی
شباب و حسن کا اک منجمد وہ جام بلّور
خیال و خواب سے نزدیک اور لبوں سے دور
نہ جانے کون سے ایواں میں ہو وہ مست خرام
رُکا رُکا سا نظر آ رہا ہے ماہ تمام

بدن کو اپنے سمیٹے ہوئے کدھر اے دوست
تری جوانی تری مفلسی تری اُلفت
کسی دیہات میں جاڑے کی چاندنی جیسے
سکوت چھایا ہوا زمزموں کے دامن میں
الاؤ جلتے ہوئے جھونپڑوں کے مدفن میں

اُداس چہروں پہ مجبوریوں کا افسانہ
نظر تھکی ہوئی آسودگی کا پیمانہ

بدن کو اپنے سمیٹے ہوئے کدھر اے دوست
ترا یہ شوق تری مفلسی گناہِ عظیم
ابھی تو تجھ کو کئی رات یونہی جلنا ہے
پہنچنے کیلئے عشرت کی شاہراہوں تک
اِن اونگھتی ہوئی پگڈنڈیوں پہ چلنا ہے

بڑھوا منگل[1]

فتح و ظفر کا شور اُٹھا
صد مرحبا صد مرحبا
مغرب کا خونی دیوتا
تھک کر بالآخر رہ گیا
صد مرحبا، صد مرحبا
بھولے ہوئے دن عیش کے
پھر سب کو یاد آنے لگے

نوٹ[1]. بڑھوا منگل اُس میلہ کا نام ہے جو بنارس میں کشتیوں پر لگا کرتا تھا۔ تقریباً پندرہ سال کے بعد مئی ۱۹۴۵ء میں یہ میلہ بطور یادگار منایا گیا۔

رنگین نغمے زیست کے
پھر مل کے سب گانے لگے
عشرت کا سامان ہو گیا
اونچے محل جتنے بھی تھے
سب میں چراغاں ہو گیا
گنگا میں بھی موج آ گئی
غمگین دلوں کو بھا گئی
ساحل پہ بجرے لگ گئے
سازِ طرب بجنے لگے
کس درجہ مرغوب و حسیں
ریتی پہ آتشبازیاں
چھنکنے لگیں، چھٹنے لگیں
یہ آگے پیچھے کشتیاں
سیرِ چراغاں کو رواں
بجنے لگیں شہنائیاں
لٹنے لگیں رعنائیاں

سب کچھ ہے لیکن کس لئے
اس جشن کے سارے مزے
بے کیف لگتے ہیں مجھے
ہر تارِ جاں بیتاب ہے
اور تشنۂ مضراب ہے
بادِ مخالف چل گئی
مسرور دل کو مل گئی
ساحل کی جانب اک نظر
او کم نظر او بے خبر
یہ اجتماعِ بے کراں
یہ خلقت پیر و جواں
بھوکے ہیں یا بیمار ہیں
ننگے ہیں یا مُردار ہیں
لیکن یہ منکنکا[۵۷] نہیں
کیا اس جگہ گنگا نہیں

---

۵۷ منکنکا اُس گھاٹ کا نام ہے جہاں لاشیں جلائی جاتی ہیں۔

یہ تو دسا سومید[1] ہے
اس میں بھی کوئی بھید ہے
مانجھی وہیں لے چل مجھے
سوگند اِس جل کی تجھے
کشتی مری اب موڑ دے
لے جاکے مجھ کو بھی وہیں
اُن سیڑھیوں پر چھوڑ دے
بجنے دے یہ شہنائیاں
لُٹنے دے یہ رعنائیاں
یہ مطربہ یہ روشنی
یہ قمقموں کی چاندنی
جب مانگیں تب مِل جائیگی
جب چاہیں تب کھِل جائیگی

بیڑا کنارے دیکھ کر
[illegible]ر اشارے دیکھ کر

---

[1] دسا سومید اس گھاٹ کا نام ہے جہاں اہل شہر خوشیوں کے موقع پر جمع ہوتے ہیں اور گنگا اشنان کرتے ہیں

مجمع یہ کیوں پھٹنے لگا
ہر شخص کیوں ہٹنے لگا
کائی ہیں کیا حیوان یہ
بھیڑیں، ہیں کیا انسان یہ
ڈھیلا گرا اور پھٹ گئے
کوئی بڑھا اور ہٹ گئے

اے ہمدمِ دیرینہ سُن
اے سینۂ بے کینہ سُن
تو نے نہ پہچانا مجھے
کیا جانے کیا جانا مجھے
یہ تیرا جسمِ نازنیں
مجبور رہ کر بھی حسیں
ہے نیم عریاں کس لئے
مجبورِ عصیاں کس لئے
نظروں سے مایوسی عیاں
چہرے پہ غربت کے نشاں

کاسہ گدائی کا سلئے
افلاس کا پیالہ لیئے
حلقے پڑے ابرو ترے
گھٹے پڑے بازو ترے
کیا دیکھنے کو آئے تھے
کیا مانگنے کو آئے تھے
سہمے ہوئے سوکھے ہوئے
کیوں لب ترے خاموش ہیں
بھولے ہوئے سمٹے ہوئے
نالے کہاں روپوش ہیں
کچھ میری سُن یا خود سُنا
کیا سچ بھی کہنا ہے بُرا
کاشی کی ایسی دل نشیں
کتنی مقدس سرزمیں
حجروں میں جس کے قرنہا
شیخ و برہمن جاگزیں

مسجد بھی مندر بھی یہاں
اونچے خداؤں کے مکاں
سنتے تھے لیکن آج ہی
یہ بھی حقیقت دیکھ لی
دکھن[له] سے اُتّر کی طرف
بہتی ہے گنگا بھی یہیں

جب جشن کا یہ وقت ہے
پھر زندگی کیوں سخت ہے
کہنے کی ساری بات ہے
اس روشنی سے کچھ نہیں
یہ رات پھر بھی رات ہے
دریا کا پانی لال ہے
فطرت کا دل پامال ہے
وہ مطربہ وہ قمقمے
گجروں سے وہ بجرے سجے

له گنگا کے بہاؤ کا رُخ صرف بنارس میں جنوب سے شمال کی جانب ہے یعنی کنایتاً گنگا اُلٹی بہتی ہے

اسّیؔ کو واپس ہو گئے
ننگے جو تھے ننگے رہے
بھوکے جو تھے بھوکے رہے
پھولوں کی چادر کیا کرے
نغموں سے دوزخ کیا بھرے

فتح و ظفر کا شور اٹھا
صد مرحبا، صد مرحبا

ؔ اسّی سب سے آخری گھاٹ کا نام ہے۔

اُلجھنیں

اب تفنگوں کی دھمک گولوں کی بوچھار نہیں
جُھنڈ کے جھنڈ وہ طیاروں کی یلغار نہیں
کرۂ ارض پہ سناٹا سا اک چھایا ہے
جیسے دن بھر کا تھکا ماندہ مسافر سرِ شام
اپنی گٹھڑی کے سہارے کسی ویرانے میں
کبھی چلتا ہے کبھی بیٹھ کے سستاتا ہے
یا کسی مسجدِ بوسیدہ میں سو جاتا ہے
آگ اور خون کی دلدل سے گذر جانے کے بعد
تھک کے اقوام جہاں بھی یونہی سو جائیں گے کیا

کب تلک چھاتیوں پر اپنی دبائے رہیں سل
کاٹھ کی پتلیوں سے اب تو بہلتا نہیں دل
ہم ابھی طفلک نادان سے بدتر ہی سہی
لیکن احساس کے اس چڑھتے ہوئے دریا میں
دیکھیں کے روز چلی چلتی ہے کاغذ کی یہ ناؤ
ایک حسرت ہے فقط ایک ہی حسرت دل میں
یعنی کب صبح ہو کب رات کا جادو ٹوٹے

میرے ایوان تخیل کے سراسیمہ نقوش
یوں اُبھرتے رہیں چمکتے ہیں بجھ جاتے ہیں
جیسے یہ چاند یہ تارے یہ شہاب ثاقب
زندگی اپنی مگر بارِ حوادث کے تلے
رینگتی ڈرتی سسکتی ہی چلی جائے گی
میرے ہنستے ہوئے چہرے پہ نہ جانا اے دوست
زہر کو زہر سمجھ کر ہی پیئے بیٹھا ہوں
ایک انبار دہکتے ہوئے انگاروں کا
اپنے سینے میں بہر حال لئے بیٹھا ہوں

نئی کروٹ

زندگی نے نئی کروٹ بدلی
اُفقِ دل پہ شفق لہرائی
تلخیٔ شب نے دُھندلے چہروں پر
سُرخیٔ نورِ سحر بل کھائی

دیکھ کر سینۂ گیتی پامال
آگیا خاک کے ذرّوں کو جلال

لاؤ دکھلاؤ کہاں ہے وہ لہو
جم کے جو رہ گیا تھا پلکوں پر

لیلیٰ وقت کی آغوش ہے وا
اپنے غم خانوں سے نکلو باہر

خشم آگیں وہی زہریلے ہونٹ
لے کے امرت سوئے بیمار آئے
ایک ہو جانے کو دو ہات اُٹھے
کب کے بچھڑے ہوئے غمخوار آئے
درِ زنداں کے چٹخنے لگے قفل
کیوں سلاسل کے دہن ہیں ویراں
ابن آدم کے پسینوں کے تلے
دب گیا آگ کا سیلاب گراں
بنتِ حوّا کی سلگتی ہوئی آہ
کر گئی آہنی پنجوں کو دھواں
خون میں ڈوبی ہوئی سنگینوں کو
کھا گئی رینگتے بچوں کی فغاں
توڑ کر آہنی دیواروں کو
بڑھ گیا آگے بہت عزمِ جواں

اک یہودی کے قلم کی تحریر
جس کو ہر بات مٹاتا ہی رہا
ایک مجذوب کی زریں تقریر
جس کو ہر ذہن بھلاتا ہی رہا
کیسی تحریر تھی کیسی تقریر!
خواب خود بن گیا اپنی تعبیر!!
زندگی نے نئی کروٹ بدلی
اُفقِ دل پہ شفق لہرائی

مائیٹی ایٹم

اک دھماکا سا ہوا رُک گئی نبضِ پیکار
رات کے پردۂ تاریک سے نکلا اک ہات
خود بخود بجنے لگے سازوں کے اُلجھے ہوئے تار
ایک لمحے کے لیے جل اُٹھی پھر شمعِ حیات

اُڑھ کے ذرّات زمیں تا بہ فلک جا پہنچے
قصرِ ہستی کے مکیں عرش تلک جا پہنچے
ٹوٹتے نشّہ کے مانند جہاں کی رگ رگ
پھر نہ ہو جائے کہیں دامِ تشنج کا شکار

تلخیٔ مے سے جو گھبرائے وہ میکش ہی نہیں
آخری جرعہ جو پی لیگا وہی ہے ہشیار

قطرہ قطرہ ہے لئے اپنے میں اک بحر کمال
ذرے ذرے میں ہے پوشیدہ بلاخیز ابال

بحر ظلمات میں پھر ڈوب گئی روح سکوں
خوف سے اور دھڑکنے لگے سہمے ہوئے دل

اپنی کمزوری کے احساس کی ماری مخلوق
زعم خود سازی میں اوروں کے زیاں سے غافل

اہرمن ہنس پڑا اس طرز جہانبانی پر
کنگرے جھک گئے ایوانوں کے ہلنے لگے در

کس قدر بے بس و کم مایہ نظر آتا ہے
جب گراں قدر کو محدود کیا جاتا ہے

فکر انسانی کا اس درجہ مزیّن شہکار
حرفِ بربادی تہذیب ہوا جاتا ہے

اپنے ان ہاتوں نے اپنا ہی گلا گھونٹ دیا
قافلے والوں نے خود قافلے کو لوٹ لیا

ہم نے چاہا تھا کہ اس قوتِ بے پایاں سے
اپنی خود ساختہ دوزخ کو بنا لیں جنّت
نہ کہ امید جو کچھ تھی بھی وہی مٹ جائے
جنسِ قربانی کی دُنیا میں رہی کیا قیمت
پھٹ کے ذرّے بھی فنا ہو گئے کچھ کر نہ سکے
دامنِ زیست تہی کر گئے اور بھر نہ سکے

کون ہنسا؟

ہنسا۔ یہ کون ہنسا۔ کیوں ہنسا۔ عجیب سی بات
یہ دور کشمکش زیست یہ غم و آلام
فضا میں گونج رہی ہے صدائے ضربِ حسام
ہمارا سامعہ اور یہ ہمارے گونگے ہونٹ
نہ جانے کب سے ترستے ہیں اک ہنسی کیلئے
مگر یہ کون ہنسا۔ کیوں ہنسا عجیب سی بات
ابھی تو دیکھنے میں کوئی ایسی بات نہیں

وہ چند ایک صحت مند خوش لباس انساں
جو حاشیوں پہ کھڑے کب سے زہر خنداں ہیں
اُنھیں سے پوچھیں کہ ہنستا ہے کس طرح کوئی

سیاہ ماضی کا اک سلسلہ ہے حال اپنا
نہ لائی عید بھی برسوں سے اپنی جھوٹی خوشی
نہ رنگ ہے نہ گلال اس جنم کی ہولی میں
بس ایک تہلکہ اک شور ہے ہواؤں میں
کہ جنگ چھڑ ہی گئی مختلف خداؤں میں
مگر یہ کون ہنسا۔ کیوں ہنسا عجیب سی بات

ابھی تو نوحہ گری سے ہمیں نجات نہیں
ابھی تو ہنسنے کی اس وقت کوئی بات نہیں
ابھی تو ایک بڑا انقلاب آئے گا

ابھی تو آگ کا طوفاں ہے بند آہوں میں
ابھی تو مشعلیں خاموش ہیں نگاہوں میں

ابھی تو خاک بسر ہیں شگوفہ ہائے چمن
ابھی تو کھیتوں میں چلتی ہے بھوک کی آندھی
ابھی تو بھٹیوں میں اور چاہیئے ایندھن
ابھی تو دیر و حرم کے ہیں رنگ زرد اور سبز
ابھی تو اپنا گریبان ہے اور اپنا ہی ہات
تو پھر یہ کون ہنسا۔ کیوں ہنسا عجیب سی بات

ہمارے کان ہنسی کے ابھی نہیں عادی
ابھی تو صرف اُٹھا کرتی ہے مہیب صدا
اسی فضا سے اسی بیکراں سمندر سے

یہ چھوٹے چھوٹے تغیر، یہ اوچھے اوچھے وار
بتا رہی ہیں یہ بے چین کروٹیں ملے دوست
کہ جلد ایک بڑا انقلاب آئے گا

تقسیم پنجاب

ہٹ گئے ہوش کے محور سے تمدّن کے قدم
زندگی برسوں کی بیمار نظر آتی ہے
یوم آزادی کا ہر لمحہ جھکائے ہوئے سر
جس کی ہر سانس میں مدقوق تعفّن لرزاں
داد خواہی کے لئے پھر سوئے مغرب ہے رواں
جل رہی ہے سر بازار چتا غیرت کی
موت اور ذلیت کے دوراہے پہ پہرا دینے
اہرمن اپنے جہنم سے نکل آیا ہے

آج پھر صاعقہ بردوش ہوا ابلیس کی فوج
پڑ گئی تہلکے میں امن وسکوں کی ہر موج
بھیڑیئے آدمی کے روپ میں گھس آئے ہیں
زہر پیوست ہوا جاتا ہے شریانوں میں
بربریت کے ہوس خانے ہوئے پھر آباد
پھر اُٹھالے گیا سیتا کو کوئی راون آج
اب دُرپدی کے جسد پر نہیں باقی کوئی تار
عصمتِ مریم وحوا کی حقیقت ہوئی خواب
ہٹ گئے ہوش کے محور سے تمدن کے قدم
زندگی برسوں کی بیمار نظر آتی ہے

جیسے اب خشک ہیں پنجاب کے سارے دریا
سونے کی بالیاں جن کھیتوں میں لہراتی تھیں
اب اُنھی کھیتوں میں اُڑتے ہیں حیاسوز شرار
اور لہو سے اُنھیں سیراب کیا جاتا ہے
اِسی مٹی سے بنیں گے نئے تقدیس کے گھر
گُردوارے نئے مسجد نئی مندر بھی نئے

دور اک دوسرے سے دور بہت دور کہیں
کہ مبادا کہیں مِل جل کے دلوں کے یہ چراغ
اک نئی آگ سے بھر دیں نہ زمانے کا ایاغ
پھر کہیں جاگ نہ اُٹھے کوئی جلیاں والا
پھر بھڑک اُٹھے نہ خودداری سے انساں کا دماغ
درس کم مائگی کو بھول نہ جائیں یہ عوام
ان کو رکھتا ہے ابھی صدیوں اسی طرح غلام
اب یہ پنجاب نہیں ایک حسیں خواب نہیں
اب یہ دوآب ہے سہ آب ہی پنجاب نہیں
اب یہاں وقت الگ صبح الگ شام الگ
مہ و خورشید الگ انجم فلک گام الگ
اسی تقسیم نے پنجاب تجھے لوٹ لیا
مرغزاروں کو ترے کھا گئی منحوس نظر
اب رگوں میں تری پگھلی ہوئی چاندی نہ رہی
اب ترے حسن میں وہ پہلی سی مستی نہ رہی
سوہنی اب نہ مہینوال کو ئی گائے گا
اب یہاں ہیر کو رانجھا نہ کبھی پائے گا

کیونکہ ان نغموں میں عرفاں کی جھلک آتی تھی
ایسے گیتوں سے اخوت کی مہک آتی تھی
ان کے ہر بول میں اک تازہ تغیر تھا نہاں
مگر اب دانشِ افرنگ کے فتووں کی قسم
ہٹ گئے ہوش کے محور سے تمدن کے قدم
زندگی برسوں کی بیمار نظر آتی ہے

ماں

کس نے ان آہنی دروازوں کے پٹ کھول دئے
کس نے خونخوار درندوں کو یہاں چھوڑ دیا
کس نے آنچل پہ مرے ڈال دئے انگارے
ٹھیک سے کٹنے بھی پایا نہ تھا طوق گردن
ابھی تو صدیوں کا پامال تھا میرا خرمن
اُس پہ ان وحشی لٹیروں نے سیہ کاروں نے
میرے ارمانوں کو تاراج کیا لوٹ لیا
میرے معصوموں کو بے خانہ و برباد کیا
میری بہوؤں سے ہوس خانوں کو آباد کیا

جل گیا میرا چمن لُٹ گئی سب میری بہار
میرے بربط میں کوئی تار نہیں اب ثابت
میری چیخوں میں کوئی درد نہیں اب باقی

میرے پیارو مری چھاتی سے لپٹنے والو
آگ وہ دل میں لگی ہے کہ میں ہی جانتی ہوں
یوں مری کوکھ جلی ہے کہ میں ہی جانتی ہوں
میرے بچو مری ناموس کے پہریدارو
دیکھو نیزوں پہ تمہارے ہیں یہ کس کی لاشیں
تم نے خود لوٹ لیا اپنی ہی بہنوں کا سہاگ
مانگ میں جھونک دی سیندور کی جگہ تم نے آگ
شرم سے اب تو ہوئی جاتی ہے گردن مری خم
(پانی پانی ہوا جاتا ہے مصور کا قلم)

یہ ترا بیت مقدس تری رفعت کا مزار
کس کی منحوس نگاہوں کا بنا آج شکار

کیا ہوئے میرے وہ منصوبے وہ خوابِ فردا
جل گیا میرا چمن لُٹ گئی سب میری بہار
میرے بربط میں کوئی تار نہیں اب ثابت
میری چیخوں میں کوئی درد نہیں اب باقی

گمراہ رہبر سے

زلزلے قصرِ ہوائی میں ترے آنے لگے

وقت کے جھٹکوں سے قانون ترا ٹوٹ گیا
جس کو ٹیکے تو کھڑا تھا وہ عصا چھوٹ گیا
کھل گئے تیری فسوں کاری کے سارے پھندے
وہ جو اک جال بُنا کرتے تھے اوہام ترے

کرم خوردہ کسی چادر سے زیادہ تو نہیں

یہی ہلتی ہوئی دیواریں اصولوں کی ترے
اپنے ملبے میں دبا لیں گی تری ہستی کو

اور یہ چلتی ہوئی تلواریں حریفوں کی ترے
پاٹ دیں گی تری لاشوں سے تری پستی کو

تو نے غربت کو تشکر کی بلندی دے کر
نسلِ آدم کی فناگاہ بنا رکھی ہے

یہ ترا فلسفۂ کہنہ و مجبور و غلام
ترا پارینہ تمدن ترا فرسودہ نظام
سب دھندلکے ہی تو ہیں ڈوبکے رہ جائینگے
اک نئی صبح کے سیلاب میں بہہ جائینگے

یہ ترا جبہ و خرقہ یہ حریری ملبوس
گھپ سیہ فام اک آندھی میں بگولوں کا حصار
تیری زنار سے لپٹے ہوئے صدہا افعی
تیری رفتار کا چلتا ہوا کالا جادو
تیری گفتار کا پھیلا ہوا دامِ تزویر
تیری دستار کے پیچوں کا یہ گرداب عظیم
ایک بوسیدہ تبسم کا سہارا لے کر
ابنِ آدم سے عزازیل کا بدلہ لینے

پے بہ پے مستعدِ جنگ رہا کرتے ہیں
گھات میں بیٹھے ہوئے راہ تکا کرتے ہیں

اب مگر آہنی ناخون ترے کند ہوئے
اب ترے جبڑوں سے بہنے کو ہے خود تیرا لہو

وقت کے جھٹکوں سے قانون ترا ٹوٹ گیا
جس کو ٹیکے تو کھڑا تھا وہ عصا چھوٹ گیا

رقصِ بسمل

انتظار اور ابھی اور ابھی اور ابھی

کٹ گئی رات مگر رات کی صہبا کا خمار
اپنی آنکھوں میں لئے مطربۂ صبح اٹھی
کھڑکی آڑ میں بجھتے ہوئے تاروں کی قطار
لبِ خورشید پہ اب آنے ہی والی ہے ہنسی

اعتبار اور ابھی اور ابھی اور ابھی
انتظار اور ابھی اور ابھی اور ابھی

دعوتِ خواب ہمیں کون دیئے جاتا ہے
شوق کی بے سروسامانی شبِ غم تک ہے
کون بھرپور یاں دے کر ہمیں بہلاتا ہے
احمریں باہوں کا آرام خنکی شبنم تک ہے
سوگوار اور ابھی اور ابھی اور ابھی
انتظار اور ابھی اور ابھی اور ابھی

وہی بے نور دماغ اور وہی چہروں پہ غبار
حسرتوں کا وہی پامال صنم خانۂ دل
وہی ہر ذہن میں امیدوں کے اُلجھے ہوئے تار
تلخیٔ زیست سے چھلکے ہوئے پیمانۂ دل
بے قرار اور ابھی اور ابھی اور ابھی
انتظار اور ابھی اور ابھی اور ابھی

چند قطرے سرِ مژگاں جو چلے آئے ہیں
ان کو آنے دو ڈھلکتے ہیں ڈھلک جانے دو
ہم نے ان آنسوؤں کے گیت بہت گائے ہیں
ساغرِ تلخ چھلکتا ہے چھلک جانے دو
انتشار اور ابھی اور ابھی اور ابھی
انتظار اور ابھی اور ابھی اور ابھی

ناتمام آج بھی رہ جائے نہ یہ رقص حیات
آفرینش سے اسی رقص میں ہے روحِ بشر
رقص ہاں رقص وہی آخری پیغامِ نشاط
رقص بسمل سے ہوا کرتا ہے آغازِ سحر

سوئے دار اور ابھی اور ابھی اور ابھی
انتظار اور ابھی اور ابھی اور ابھی

مداوا

کتنے بیباک ہیں شاعر اب کے
کتنے عریاں ہیں یہ افسانہ نگار

کچھ سمجھ میں مرے آتے ہی نہیں
ان ادب سوزوں کے گنجلک اشعار

یوں تو اپنے کو یہ کہتے ہیں ادیب
پڑھتے ہیں جنگ کے لیکن اخبار

کبھی یورپ کا کبھی یورب کا
ذکر کرنے میں اُڑاتے ہیں شرار

داستانیں نہ قصیدے نہ غزل
ادب تلخ کی ہر سو بھرمار

کبھی پنجاب کی بھونڈی باتیں
کبھی بنگال کے گندے افکار

خون آلودہ ہیں ان کی نثریں
پیپ بہتے ہوئے ان کے اشعار

ان کے افسانوں کے موضوع عجیب
وکالی لڑکی، کبھی کالی شلوار

ان داتا سے کبھی لڑ بیٹھے   کبھی افلاس پہ کھینچی تلوار
ان کی نظموں میں کوئی لطف نہیں   نہ کوئی نغمہ نہ تفسیرِ بہار
کبھی آوارہ، کبھی خانہ بدوش   کبھی عورت، کبھی "مینا بازار"
بد مذاقی کی سراسر باتیں   رنگ و بو چھوڑ کے آندھی کی پکار
حرفِ آخر، کی وہ شمشیرِ دو دم   زہر میں ڈوبی ہوئی جس کی دھار
جنگِ آزادی، کا سر میں سودا   "بیسوا" کے لئے اتنے ایثار
عیب پوشی انھیں آتی ہی نہیں   زخم دھوتے ہیں سرِ راہگذار

ایک میں بھی تو ہوں پکا شاعر   مگر ان باتوں سے بالکل انکار
سندِ ماضی سے پُر میرا کلام   فکرِ امروز سے کرتا ہوں فرار
ہوتا ہے صاف مرا ہر مصرع   ایک بھی شعر نہیں ذہن پہ بار
لیکن اس کے لئے اب کیا میں کروں   یہ سمجھتے نہیں مجھ کو فنکار

انقلاب اور ادب ہائے غضب   کتنے مخدوش ہیں یہ سب آثار
گورکی، جابر و نذر الاسلام   یہی دو چار ہیں ان کے معیار
سننے میں آیا ہے بہرے مرے کان   کہ خدا سے بھی انھیں ہے انکار
مذہبوں سے انھیں بے حد نفرت   معبدوں پر یہ اڑاتے ہیں غبار

حکمرانوں کا کوئی خوف نہیں　　اُمرا کا نہیں کچھ دل میں وقار
چاند پر خاک اُڑانے کے لئے　　جب بھی دیکھا انھیں پایا تیار
مختصر یہ کہ ہر اک فعل ان کا　　شعلہ در قصر شکن در دیوار
میں تو عاجز ہوں الٰہی توبہ　　آخر آئے گا کبھی اُن کو قرار

کوئی للّٰہ ہٹاؤ ان کو
جاگ اُٹھے ہیں سلاؤ ان کو

بہ نامِ عمل

ہمارا سازِ خوں آشام تلوار
ہمارا نغمہ تلواروں کی جھنکار

قطعے

دریا میں تلاطم برپا ہے کشتی کا فسانہ کیا معنی
گرداب سے جب لڑنا ہے تمھیں تنکے کا سہارا کیا معنی
یہ نوحۂ کشتی بند کرو خود موج طوفان بن جاؤ
پیروں کے تلے ساحل ہوگا ساحل کی تمنا کیا معنی

قوت کے اُمنڈتے دریا میں مجبوریٔ انساں یاد رہے
اک ہم تھے جو تجھ سے دب نہ سکے اے شورشِ طوفاں یاد رہے
گرداب کی زد میں آ آ کر موجوں کے تھپیڑے کھا کھا کر
دھاروں کو پریشاں کر ڈالا اور تجھ کو پشیماں یاد رہے

منہ ڈھانکے پڑے ہوں گے چشمے وہ وقت بھی اب کچھ دور نہیں

ڈھونڈے نہ ملیں گے جب یہ ہمارے وہ وقت بھی اب کچھ دور نہیں

پایاب ترا سینہ پاکر بیروں سے تجھے سب روندیں گے

اور ساحل سے ہم دیکھیں گے وہ وقت بھی اب کچھ دور نہیں

بھوکا بنگال

پورب دیس میں ڈگی باجی پھیلا سکھ کا کال
دُکھ کی اگنی کون بجھائے سوکھ گئے سب تال
جن ہاتوں نے موتی رولے آج وہی کنگال رے ساتھی
آج وہی کنگال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال

بیٹھ سے اپنے پیٹ لگائے لاکھوں اُلٹے کھاٹ
بھیک منگائی سے تھک تھک کر اُترے موت کے گھاٹ

جیون مرن کے ڈانڈے ملائے بیٹھے ہیں چنڈال رے ساتھی
بیٹھے ہیں چنڈال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال

ندی نالے گلی ڈگر پر لاشوں کے انبار
جان کی ایسی مہنگی شے کا اُلٹ گیا بیوپار
مٹھی بھر چاول سے بڑھ کر سستا ہے یہ مال رے ساتھی
سستا ہے یہ مال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال

کوٹھریوں میں گانجے بیٹھے بنئے سارا ناج
سندر ناری بھوک کی ماری بیچے گھر گھر لاج
چوپٹ نگری کون سنبھالے چار طرف بھونچال رے ساتھی
چار طرف بھونچال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال

پرکھوں نے گھر بار لٹایا چھوڑ کے سب کا ساتھ
مائیں روئیں بلک بلک کر بچے بھئے اناتھ
سدا سہاگن بدھوا باجے کھولے سر کے بال رے ساتھی
کھولے سر کے بال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال

اتّی پتّی چبا چبا کر جوجھ رہا ہے دیس
موت نے کتنے گھونگھٹ مارے بدلے سَو سَو بھیس
کال بکٹ پھیلائے رہا ہے بیماری کا جال رے ساتھی
بیماری کا جال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال

دھرتی ماتا کی چھاتی میں چوٹ لگی ہے کاری
مایا کالی کے پھندے میں وقت پڑا ہے بھاری
اب سے اُٹھ جا نیند کے ماتے دیکھ تو جگ کا حال رے ساتھی
دیکھ تو جگ کا حال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال

پیاری ماتا چنتا مت کر ہم ہیں آنے والے
کندن رس کھیتوں سے تیری گود بھانے والے
خون پسینہ ہل ہنسیا سے دور کریں گے کال رے ساتھی
دور کریں گے کال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال

جنتا کی لڑائی

یہ کون اُٹھا ہے برّ و بحر میں انگڑائیاں لیتا
یہ کون اُٹھا ہے کشتی خون کے طوفان میں کھیتا
یہ کون اُٹھا ہے اپنی جان کی قربانیاں دیتا
یہ مزدوروں کا لشکر ہے کسانوں کی چڑھائی ہے
یہ جنتا کی لڑائی ہے

یہ کس نے سر اُٹھایا کس نے دنیا کا چلن بدلا
یہ کس نے جنگ فرسودہ کا اندازِ کہن بدلا
یہ کس کے اک اشارہ پر نظر بدلی سخن بدلا

یہ مزدوروں کا لشکر ہے کسانوں کی چڑھائی ہے
یہ جنتا کی لڑائی ہے
جہاں توپیں تھیں محوِ خواب گو توپیں گرجتی تھیں
محاذِ اتحادی کی انھی نے دعوتیں دی تھیں
انھی نے سب سے پہلے آشتی کی کوششیں کی تھیں
یہ مزدوروں کا لشکر ہے کسانوں کی چڑھائی ہے
یہ جنتا کی لڑائی ہے
یہاں ہر قطرۂ خوں جنسِ آزادی کی قیمت ہے
یہاں انسان کو انسان سے کتنی محبت ہے
یہاں کا ہر سپاہی مادرِ گیتی کی دولت ہے
یہ مزدوروں کا لشکر ہے کسانوں کی چڑھائی ہے
یہ جنتا کی لڑائی ہے
یہاں تفریقِ رنگ و قوم کا سکّہ نہیں ڈھلتا
یہاں غداروں کی تخریب کا دیپک نہیں جلتا
یہاں پر پانچویں دستے کا بھی جادو نہیں چلتا
یہ مزدوروں کا لشکر ہے کسانوں کی چڑھائی ہے
یہ جنتا کی لڑائی ہے

یہ وہ ہیں جن سے فاشیت کو سب سے بڑھکے خطرہ ہے

یہ وہ ہیں جن کو اپنے دست و بازو پہ بھروسہ ہے

یہ وہ ہیں سورما جن کا زمانے بھر میں چرچہ ہے

یہ مزدوروں کا لشکر ہے کسانوں کی چڑھائی ہے

یہ جنتا کی لڑائی ہے

انھیں مقصد نہیں فتح و ظفر سے ملک گیری کا

کہ ان کا ملک تو ہر ملک ہے اپنا پرایا کیا

یہ لڑتے ہیں کہ اس بھٹی سے پھر شعلے نہ ہوں پیدا

یہ مزدوروں کا لشکر ہے کسانوں کی چڑھائی ہے

یہ جنتا کی لڑائی ہے

عجب انداز سے یہ جنگ کرتے ہیں زمانے میں

زراعت میں کوئی، سرگرم کوئی کارخانے میں

کوئی لڑتا ہے کوئی مست ہے جنگی ترانے میں

یہ مزدوروں کا لشکر ہے کسانوں کی چڑھائی ہے

یہ جنتا کی لڑائی ہے

یہ فاشیت کو دنیا سے مٹا لیں گے تو بیٹھیں گے

یہ استبداد کے ایواں کو ڈھا لیں گے تو بیٹھیں گے

یہ نغمے اپنی آزادی کے گالیں گے تو بیٹھیں گے

یہ مزدوروں کا لشکر ہے کسانوں کی چڑھائی ہے

یہ جنتا کی لڑائی ہے

یہ جنتا کی لڑائی ہے

منادی

اُٹھو اے جاں فروشو سر کٹانے کے لئے اُٹھو
وطن کے دشمنوں کا خوں بہانے کے لئے اُٹھو
نزاعِ باہمی کو بھول جانے کے لئے اُٹھو
لپکتے شعلوں سے دامن بچانے کے لئے اُٹھو
لگی ہے آگ مشرق میں بجھانے کے لئے اُٹھو

اُٹھو اے جاں فروشو ــــــــــ

اِدھر بنگال میں قحط و وبا کا دور دورہ ہے
تباہی جاں کنی غارتگری ہر سمت برپا ہے
اُدھر عفریت محور کو سیہ کاری کا دعویٰ ہے

تم اب اس زعمِ باطل کو مٹانے کے لئے اُٹھو
لگی ہے آگ مشرق میں بجھانے کے لئے اُٹھو
اُٹھو اے جاں فروشو ——————

اُٹھو اور یوں اُٹھو جیسے کوئی طوفان اُٹھتا ہے
جنونی کے جگر میں جس طرح ہیجان اُٹھتا ہے
بس اب بیدار ہو جاؤ کہ وہ جاپان اُٹھتا ہے
وطن کو آفت نو سے بچانے کے لئے اُٹھو
لگی ہے آگ مشرق میں بجھانے کے لئے اُٹھو
اُٹھو اے جاں فروشو ——————

زنداں

یہ اونچی اونچی دیواریں

یہ زنجیروں کی جھنکاریں

گولی کے یہ چلنے کی سن سن

پھیلا ہوا اگنی کا دامن

کس جرم کی ہیں یہ یادا شیں

کیوں لوٹتی پھرتی ہیں لاشیں

اس ظلم کی کوئی حد بھی ہے

آخر کوئی اس کا رد بھی ہے

یہ اونچی اونچی دیواریں
یہ زنجیروں کی جھنکاریں

بہتی ہے یہاں اُلٹی گنگا
نوکر چنگا مالک ننگا

کھانے کو لوہے کی تھالی
گندی گندی کالی کالی

خونخوار نگاہوں کی سازش
پیٹھوں پر کوڑوں کی بارش

ہاتوں میں چکّی کے چھالے
ہر سانس پہ جینے کے لالے

قدغن ہے لبوں کے ہلنے پر
پابندیاں آنکھیں ملنے پر

یہ اونچی اونچی دیواریں
یہ زنجیروں کی جھنکاریں

چھپ چھپ کے یہ ملنا آپس میں
بھٹکتے ہوئے دل کس کے بس میں

خاموش نظر کے جیکارے
یہ جیکارے یہ انگارے
اک روز قیامت ڈھائینگے
بے نام ونشاں کر جائینگے

یہ اونچی اونچی دیواریں
یہ زنجیروں کی جھنکاریں

قدم کی جھنکار پر

ازل سے دوشِ برق پر ہے سرکشوں کا آشیاں
افق پہ انتقام کے کڑک رہی ہیں بجلیاں
کہ بھوک کی چتا میں کب سے جل رہی ہیں ہڈیاں
غلام اپنی بندگی سے ہو گیا ہے بدگماں

یہ بیسویں صدی کے نوجواں کا شاہکار ہے
کہ زندگی کے موڑ سے گزر رہا ہے کارواں

یہ کیا ازدحام ہے یہ کیسی گیر و دار ہے

"جو ہم نہیں تو کچھ نہیں" کی ہر طرف پکار ہے
رگوں میں سورماؤں کے بھری ہوئی ہیں بجلیاں

یہ بیسویں صدی کے نوجواں کا شاہکار ہے
کہ زندگی کے موڑ سے گذر رہا ہے کارواں

ذرا یہ جبر و قہر کی حدود سے نکل تو لیں
رواں دواں اُٹھے ہوئے قدم ابھی سنبھل تو لیں
یہ روکنے سے کب رُکیں گے چند گام چل تو لیں
کھنچے ہوئے ہیں ان کی چتونوں پہ عزم کے نشاں

یہ بیسویں صدی کے نوجواں کا شاہکار ہے
کہ زندگی کے موڑ سے گذر رہا ہے کارواں

یہ کس نے راہ چھوڑ دی، یہ کون ڈر کے ہٹ گیا
یہ کس کی نبض رُک گئی، یہ کس کا زور گھٹ گیا
یہ کس کا تختۂ فریب و مکر ہی پلٹ گیا
نظامِ کہنہ کی جہاں میں اُڑ رہی ہیں دھجیاں

یہ بیسویں صدی کے نوجواں کا شاہکار ہے
کہ زندگی کے موڑ سے گذر رہا ہے کارواں

سمندروں میں ذہنیت کے شور انقلاب ہے
شباب کی اُمنگ ہے، اُمنگ کا شباب ہے
سروں میں زُعم حرّیت دلوں میں پیچ وتاب ہے
بغاوتوں کی پاسباں تپی ہوئی جوانیاں

یہ بیسویں صدی کے نوجواں کا شاہکار ہے
کہ زندگی کے موڑ سے گذر رہا ہے کارواں

کراہتی زمین کے جگر میں درد کیوں رہے
زباں پہ مُہر خامشی رُخوں پہ گرد کیوں رہے
نظر اُداس کیوں رہے یہ آہ سرد کیوں رہے
بھڑک اُٹھی ہے دل کی آگ چل رہی ہیں آندھیاں

یہ بیسویں صدی کے نوجواں کا شاہکار ہے
کہ زندگی کے موڑ سے گذر رہا ہے کارواں

مزدوروں کا کورس

جے جے بھارت ماتا

ہم سارے مزدور بھکاری
ہیں تیرے چرنوں کے پجاری
کوئی تو اب چھاتی سے لگاتا
جے جے بھارت ماتا

ہم سب محنت کرنے والے
جگ کی خاطر مرنے والے
آپس میں جوڑیں گے ناتا
جے جے بھارت ماتا

اپنے راج میں اپنی سینا
اپنی ناؤ کو خود ہی کھینا
اپنی کھیتی اپنا جاتا
جے جے بھارت ماتا

ہم لوگوں کا خون بہانے
بھارت کو بے آس بنانے
کون اُٹھا گولی برساتا
جے جے بھارت ماتا

پونجی والوں سے کیا ڈرنا
مزدوری پر ہے لڑنا مرنا
جھنڈا لال اُٹھا لہراتا
جے جے بھارت ماتا

گیت بھینگر

پھر اُٹھا طوفان

رستہ ہے انجان

مانجھی ہے حیران

سینوں میں ہیجان   پھر اُٹھا طوفان

جینا ہے جنجال

دیش بنا کنگال

ہر بھومی بنگال

ہر بستی ویران   پھر اُٹھا طوفان

تلواروں پر ہات
جھگڑے کی ہر بات
یہ اندھیاری رات
بھوت اگن شیطان　　پھر اُٹھا طوفان

کب تک دیپک راگ
گھر میں لگی ہے آگ
پھوٹ گئے سب بھاگ
ہوش میں آ نادان　　پھر اُٹھا طوفان

ڈوب رہا سنسار
ٹوٹ چلا پتوار
کون لگائے پار
کون چڑھے پروان　　پھر اُٹھا طوفان

بول رے ساتھی بول

بول رے ساتھی بول
راج محل میں آگ لگی ہے پنچھی پنجرا کھول
کب تک یوں ہی بیٹھے رہنا بول رے ساتھی بول
جنتا جاگی، بھارت جاگا، جاگا سب سنسار
تیکھے گھاؤ اٹھانے والے کھینچے ہیں تلوار
بھور بھئی پو پھوٹن لاگی سپنے ڈانواڈول
راج محل میں آگ لگی ہے پنچھی پنجرا کھول
بول رے ساتھی بول

ہاتھی آیا ہاتھی آیا گاؤں میں اُٹھا شور

ناچ سمے جب آ پہنچا تو کوّا نکلا مور

اندھے ڈھول بجانے والے ڈھول کے اندر پول

راج محل میں آگ لگی ہے پنچھی پنجرا کھول

بول رے ساتھی بول

چلتے جانا چلتے جانا دن ہو چاہے رات

چلنے سے گھبرانا کیسا جب دینی ہو مات

تھکنے والوں کی آنکھوں میں رستہ نکلا گول

راج محل میں آگ لگی ہے پنچھی پنجرا کھول

بول رے ساتھی بول

غزلیں اور اشعار

رفیقۂ ادب اوشا کے نام

اُبھر آئینگے سن کر گوشِ دل پر انگنت چھالے
ہمارے سب سے میٹھے گیت ہیں وہ دُکھ بھرے نالے

غزلیں

(۱)

انکارِ مے پہ ساقی کی چشمِ پُر آب میں
مے خانہ ڈوبتا نظر آیا شراب میں
عقدہ یہ آج تک نہ کھُلا چشمِ مست کا
ساغر میں ہے شراب کہ ساغر شراب میں
یوں جزوِ زندگی ہوئی جاتی ہے تیری یاد
جیسے کوئی شراب ملا دے شراب میں
داؔمق برائے کیف بدلتا ہوں کروٹیں
کچھ زندگی کا لُطف تو ہے اضطراب میں

(۲)

دل ازل سے مرکزِ آلام ہے — شیشۂ آغاز میں انجام ہے
چشمِ ساقی کا یہ سارا کام ہے — نشۂ مے مفت میں بدنام ہے
بادۂ احمر سے خالی جام ہے — دل تو ہے لیکن برائے نام ہے
وجہِ تسکیں دل کی دھڑکن بن گئی — اب ہوا چلتی ہے کچھ آرام ہے
مرحبا اے کاسۂ چرخِ کہن — گردشیں جب تک ہیں تیرا نام ہے

تیری قسمت ہی میں زاہد مے نہیں
شکر تو مجبوریوں کا نام ہے

(۳)

نالہ معذور ہوتا جاتا ہے — آسماں دور ہوتا جاتا ہے
چشمِ مخمور کی دوہائی ہے — میکدہ چور ہوتا جاتا ہے

جام گردش میں ہے مگر مجھ سے
کس قدر دور ہوتا جاتا ہے

(۴)

ہم جو محبت کی قسم کھا گئے — اُن کے حسین چہرے پہ رنگ آ گئے
چل دئے وہ چھیڑ کے اک سازِ نو — دل کا سکون لے گئے وہ کیا کئے

ساقیٔ مہوش سے نظر لڑ گئی
جام و سبو نشہ میں ٹکرا گئے

(۵)

توجہ کچھ اُن کی اِدھر ہو رہی ہے
ہماری نظر معتبر ہو رہی ہے
دمِ نزع ہے پتلیاں پھر رہی ہیں
ستارے چلے اب سحر ہو رہی ہے
یہ اشکوں کے قطرے نہیں اہلِ محفل
مری داستاں مختصر ہو رہی ہے
یہ کہہ کہہ کے شمعیں بجھاتا تھا واثقؔ
وہ کل آئیں گے اب سحر ہو رہی ہے

(۶)

کھویا کھویا سا پا کے ہمیں وہ دل کی باتیں جان گئے
اور اُن کا تجاہل دیکھتے ہی ہم ان کی نظر پہچان گئے
ساقی کی نگاہیں پھرتے ہی اور ہاتھ سے شیشہ گرتے ہی
وہ کیف گیا وہ دور گیا سب جینے کے سامان گئے
پیمانہ گرا جھنکار ہوئی خاموش فضائیں گونج گئیں
دل ٹوٹتے ہی اک آہ جو کی سب رازِ محبت جان گئے
سازوں میں رہے نغمہ بن کر رگ رگ میں اٹھا ہی درد اکثر
پردوں میں چھپے تم لاکھ مگر ہم جان گئے پہچان گئے

تم وعدۂ فردا پر اُن کے لیے واثق دھوکا کھا بیٹھے
کل آئے گا کب یہ بے سوچے کیوں ان کی باتیں مان گئے

(۷)

رند جس کو شراب کہتے ہیں   اُس کو زاہد خراب کہتے ہیں
سب جسے کہتے ہیں نگاہ مست   ہم اُسی کو شراب کہتے ہیں
ہائے جس دل میں تم بنا لو گھر   اُسے خانہ خراب کہتے ہیں
وہ تو اک زندگی کی صورت ہے
جس کو سب اضطراب کہتے ہیں

(۸)

زباں تک جو نہ آئے وہ محبت اور ہوتی ہے
فسانہ اور ہوتا ہے حقیقت اور ہوتی ہے
نہیں ملتے تو اک ادنیٰ شکایت ہے نہ ملنے کی
مگر مل کر نہ ملنے کی شکایت اور ہوتی ہے
یہ مانا شیشۂ دل رونقِ بازارِ اُلفت ہے
مگر جب ٹوٹ جاتا ہے تو قیمت اور ہوتی ہے
نگاہیں تاڑ لیتی ہیں محبت کی اداؤں کو

یہ مانا حسن کی فطرت بہت نازک ہے اے واثق
مزاجِ عشق کی لیکن نزاکت اور ہوتی ہے

(۹)

اپنا اعجاز دکھا دے ساقی
آگ سے آگ بجھا دے ساقی

نقش بیداد مٹا دے ساقی
ہم کو آزاد بنا دے ساقی

وہ اُٹھیں کالی گھٹائیں توبہ
اب تو پینے کی رضا دے ساقی

جس سے سوئے دل چونک اُٹھیں
نغمہ اک ایسا سُنا دے ساقی

تجھ کو مستقبل زرّیں کی قسم
پچھلی باتوں کو بُھلا دے ساقی

صدر مے خانہ بنایا تھا کبھی
اب جہاں چاہے بٹھا دے ساقی

وہ جو تسبیح لئے ہے اُس کو
میرے آگے سے اُٹھا دے ساقی

نشۂ فکر ابھی باقی ہے
ایک جام اور اٹھا دے ساقی

قصر اوہام کو ڈھانے کے لئے
سارا میخانہ لنڈھا دے ساقی

سب جسے کہتے ہیں واثق واثق
ہم کو بھی اُس سے ملا دے ساقی

(۱۰)

رباب زندگی میں جتنے ٹوٹے تار ہوتے ہیں
انھیں کو جوڑ کر نغمے مرے تیار ہوتے ہیں

طلسمِ خوابِ غفلت توڑ کر بیدار ہوتے ہیں
سنبھل جا نشۂ دولت کہ ہم ہشیار ہوتے ہیں

زمیں لرزاں زماں لرزاں نگاہِ اہرمن لرزاں
کہ اب تیور ہمارے انقلاب آثار ہوتے ہیں

بھڑکنے کو ہیں شعلے رہ رہ کر قلب آدم سے
کہ لبہائے تبسم ریز آتش بار ہوتے ہیں

مقید ہے مری آواز لیکن بے صدا نالے
نکل کر چشمِ حسرت سے جگر کے پار ہوتے ہیں

(۱۱)

دل توڑ کر وہ دل میں پشیماں ہوا تو کیا
اک بے نیاز ناز پہ احساں ہوا تو کیا

اپنا علاج تنگیٔ دل وہ نہ کر سکے
میرا علاجِ تنگیٔ داماں ہوا تو کیا

جب بال و پر ہی نذرِ قفس ہو کے رہ گئے
صحنِ چمن میں شورِ بہاراں ہوا تو کیا

اک عمر رکھ کے رُوح مری تشنۂ نشاط
اب نغمۂ حیات پرافشاں ہوا تو کیا

جب میرے واسطے درِ میخانہ بند ہے
صہبا میں غرق عالمِ امکاں ہوا تو کیا

ٹوٹے پڑے ہیں سازِ محبت کے تار تار
اب شاہدِ خیال غزل خواں ہوا تو کیا

آدم نے ایک خوشۂ گندم کو کیا گیا
مجرم کبھی جو بھوک سے انساں ہوا تو کیا

(۱۲)

اُس دل سے کام لے جسے فردا کا ڈر نہیں
بڑھ اُس جہاں میں آ جہاں شام و سحر نہیں

اب اُس چمن میں ہم نے بنایا ہے آشیاں
جس میں گمانِ برق و شرر کا گذر نہیں

ننگ بہار، ننگ چمن ہے وہ عندلیب
نالوں میں جس کے خندۂ گل کا اثر نہیں

اُٹھ کر زمیں سے پھونکدے میں نے آسماں
پابند سنگ ہو کے رہوں وہ شرر نہیں

پیغام زندگی جو نہ ہو وہ نوا ہی کیا
تاروں سے جو نہ جھلکے وہ رنگ سحر نہیں

زنجیر ٹوٹنے کی صدا سُن رہے ہو تم
کس نے کہا ہماری فغاں میں اثر نہیں

(۱۳)

خلش سکوں کا مداوا نہیں تو کچھ بھی نہیں
شکست ساز میں نغمہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

جسے زمانہ کہے اضطراب کا عالم
وہ زندگی کا سہارا نہیں تو کچھ بھی نہیں

سرودِ بانگِ مؤذّن نہیں دلیلِ سحر
مژہ پہ صبح کا تارا نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہوا کریں ترے کان آشنائے شورِ جرس سفر کا دل میں ارادہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ مانا قلبِ زمیں تک تری پہنچ ہے مگر تلاشِ اوجِ ثریا نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہمارے بتکدۂ دل میں ڈھونڈ تو زاہد
یہیں کہیں ترا کعبہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

(۱۴)

یہ رنج و خوشی خود کچھ بھی نہیں احساس و نظر کے دھوکے ہیں
اس بھول بھلیاں میں انگنتی بام و در کے دھوکے ہیں
یہ قوس قزح، یہ ہالۂ شب خورشید و قمر کے دھوکے ہیں
سمجھے ہو جسے تم رنگِ شفق سب شام و سحر کے دھوکے ہیں
یہ صبح ہے کیا یہ شام ہے کیا یہ قصۂ حسن و عشق ہے کیا
تخئیل کی بازیگریاں ہیں اپنی ہی نظر کے دھوکے ہیں
اے اندھی جوانی والے سُن، اے رنگ پہ جانے والے سُن
یہ موہنی صورت والے سب بہروپ نگر کے دھوکے ہیں
ہنس کر جو کسی نے دیکھ لیا، تم نے بھی وہیں دل پھینک دیا
سمجھے نہ ذرا بھی اس پردہ میں دنیا بھر کے دھوکے ہیں
کیوں چٹکی کلی کیوں پھول ہنسا کیوں سارا گلستاں جاگ اٹھا

دیکھی ہے نظر بندی ایسی جو آج ہے وہ کل کچھ بھی نہیں
دو عالم کی اس بہنگی میں اک بازی گر کے دھوکے ہیں

ہنستا ہے کوئی روتا ہے کوئی واثق نہ کرو تم فکر اس کی
کھوٹی نہ کرو منزل اپنی یہ راہگذر کے دھوکے ہیں

سب کچھ ہے مگر حق بات اگر اس مادّی دنیا میں رہ کر
دھوکا ہی سمجھ میں آئے تو اوہام بشر کے دھوکے ہیں

(۱۵)

دل پریشاں ہے نہ جانے کس لئے — حشر ساماں ہے نہ جانے کس لئے
پرسکوں گہرائیوں میں ضبط کی — شورِ طوفاں ہے نہ جانے کس لئے
لاکھ آبادِ تمنا ہو کے دل — پھر بھی ویراں ہے نہ جانے کس لئے
میری بربادی پہ میرا ہر نفس — زہر خنداں ہے نہ جانے کس لئے
تشنۂ ہمت جو تھا ذوقِ فنا — آج آساں ہے نہ جانے کس لئے
خالی از علت نہیں ان کا کرم — مجھ پہ احساں ہے نہ جانے کس لئے
دیکھئے گرتی ہے یہ بجلی کہاں — وہ پشیماں ہے نہ جانے کس لئے

نوعِ انساں فصلِ آزادی میں بھی
پا بہ جولاں ہے نہ جانے کس لئے

(۱۶)

مسرتیں یوں مچل رہی ہیں حدودِ آہ و فغاں سے آگے
کہ جیسے فصلِ بہار کی ہو اُمید فصلِ خزاں سے آگے

کوئی تو ہے بات جس کا شکوہ وگرنہ بے وجہ کیسا نالہ
بیان کرتا ہوں اپنا قصہ کھلے گا شرحِ بیاں سے آگے

مرے پر و بال کو نہ دیکھو مرے نشیمن پہ یوں نہ رو و
ابھی تو خاکِ چمن ملے گی جلے ہوئے آشیاں سے آگے

خوشی سے اپنی خوشی نہیں ہے ہنسی بھی اپنی ہنسی نہیں ہے
یہ زندگی کوئی زندگی ہے فغاں نہ جائے زباں سے آگے

قدم جو ہم بھی اُٹھانے پائیں زمانے کو گردِ راہ کر دیں
جرس کی جھنکار پہنچے منزل پہ جس طرح کارواں سے آگے

سکوں ہے اُس شور کا نتیجہ جو انقلابات سے ہو پیدا
وہیں خموشیٔ نقشِ پا ہے قدم اُٹھے ہیں جہاں سے آگے

فلک کو کیا کچھ سمجھنے والو کوئی بتا دو بس اتنا ہم کو
اگر یہ حدِّ نظر نہیں ہے تو کیا ہے پھر آسماں سے آگے

گھنیری زلفوں کا سایہ بن کر ضیا، عارض تلاش مت کر

(۱۷)

وہ میرے وعدے بوقت سفر کسے معلوم
وہ اُن کی اشک بہ داماں نظر کسے معلوم

وہ بات بات پہ ہنسنا مرا کہ وہ بھی ہنسیں
مگر خیال تھا ان کا کدھر کسے معلوم

اُس اک سکوت کی دل سے کھٹک نہیں جاتی
وہ ایک خار سرِ رہ گذر کسے معلوم

وہ تلخ راتوں سے بوجھل نگاہ کے ریشم
بچھے ہوئے ہوں مری راہ پر کسے معلوم

وہ چاندنی کا ستایا ہوا کریب سا جسم
لئے ہوئے ہو امیدِ سحر کسے معلوم

(۱۸)

وہ عہدِ مسرت کی باتیں وہ وقت سہانا بھول گئے
جب سے غمِ دوراں یاد آیا سب لطف زمانہ بھول گئے

تنظیم گلستاں کی دھن میں اب شاخِ نشیمن یاد نہیں
اے گردشِ دوراں خوش ہو لے ہم اپنا ٹھکانہ بھول گئے

خاموش ہے گو بزمِ اُلفت جاتی ہی نہیں دل کی وحشت
جس شمع سے روشن تھی محفل ہم اس کو بجھانا بھول گئے

جب ہنسنے ہنسانے کے دن تھے ہم آٹھ پہر روتے ہی رہے
اب وقت جو آیا رونے کا ہم اشک بہانا بھول گئے

اندوہ کی ماری دنیا میں کچھ اپنی زباں سے کہہ نہ سکے
اوروں کے فسانے سن سن کر ہم اپنا فسانہ بھول گ

اے بربطِ جاں دکھ سہنے دے بے خوابِ شبستاں رہنے دے
جس گیت پہ نیند آتی تھی ہمیں وہ گیت ہی گانا بھول گ

اے تندیٔ صہبا دشمنِ غم کیفیتِ عالم دیکھ کے ہم
ساغر کو لگا کر ہونٹوں سے پھر اس کو ہٹانا بھول گ

اک شورِ مئے و مینا لے کر ہم ٹوٹ پڑے انگاروں پر
ہشیار رہا کر دنیا کو خود ہوش میں آنا بھول گ

اس دورِ تلاطم میں واثق کتنے ہی سفینے کھے ڈالے
اور اپنی شکستہ کشتی کو موجوں سے بچانا بھول گئے

(۱۹)

سرخ دامن میں شفق کے کوئی تارا تو نہیں؟
ہم کو مستقبلِ زریں نے پکارا تو نہیں

دست و پا شل ہیں کنارے سے لگا بیٹھا ہوں
لیکن اس شورشِ طوفان سے ہارا تو نہیں

آکے پھر لوٹ چلی کشتیٔ دل ساحل سے

اس غمِ دوست نے کیا کچھ نہ ستم ڈھائے مگر
غمِ دوراں کی طرح جان سے مارا تو نہیں

دکھ بھرے گیتوں سے معمور ہے کیوں بربطِ جاں
اس میں کچھ گرسنہ نظروں کا اشارا تو نہیں؟

اشک جو دے نہ اٹھے تو سرِ مژگاں آکر
صرف اک قطرۂ شبنم ہے شرارہ تو نہیں

اک اجالا سا جھلکتا ہے پسِ پردۂ شب
چشمِ بے خواب میں لرزاں کوئی تارا تو نہیں؟

دور مشرق میں جو روشن ہیں کئی انگارے
اپنی قسمت کا کوئی ان میں ستارا تو نہیں؟

کتنی امید دل پہ جیتا رہا واثقؔ اب تک
اب مگر اک یہی جینے کا سہارا تو نہیں

(۲۰)

دیوانے دیوانے ٹھہرے کھیل گئے انگاروں سے
آبلہ پائی اب کوئی پوچھے ان ذہنی بیماروں سے

بات تو جب ہے شعلے نکلیں بربطِ دل کے تاروں سے
شور نہیں نغمے پیدا ہوں تیغوں کی جھنکاروں سے

کس نے بسایا تھا ویران کو کس نے یوں برباد کیا
اپنے لہو کی بو آتی ہے ان اُجڑے بازاروں سے

کیسے گلے ملتے ہیں گلے سے اب کے بہاراں بھول گئے
یاروں نے بھرپور گلوں کا کام لیا تلواروں سے

کہہ دو مغنی سے اب ٹھہرے خواب آور نغمے رو کے
کوئی ہمیں للکار رہا ہے پربت سے میناروں سے

شاہ کا رُخ ہے اُترا اُترا شہ کیا دیتا ہے شاطر
ہاری بازی جیت گئے ہم پیدل سے رہواروں سے

وقت کے طوفانی دھاروں میں کتنے ساحل ڈوب گئے
نت نئے ساحل پھر اُبھرے ہیں اِن طوفانی دھاروں سے

پل میں تولہ پل میں ماشہ پل میں سب درہم برہم
ذرۂ خاکی نظریں ملائے بیٹھے ہیں سیاروں سے

پتھر کا دل پانی پانی زنداں کی تاریخوں پر
آج تلک رہ رہ کر چیخیں اُٹھتی ہیں دیواروں سے

(۲۱)

اک نئی صبح نئی شام کا دیرینہ خیال — میرے جینے کا سبب میری تمنا کا آل

صبح ہوتی ہی تو ماتھے پہ اُفق کے اے دوست
سُرخ حرفوں میں اُبھر آتے ہیں کتنے ہی سوال

(۲۲)

ہمارے میکدے کا اب نظام بدلے گا
ہم اپنا ساقی بدل دیں گے جام بدلے گا

ابھی تو چند ہی میکش ہیں باقی سب تشنہ
وہ وقت آگیا جب تشنہ کام بدلے گا

یہ اُلٹی اُلٹی ہوائیں ہیں وجہ سست روی
ہوائیں بدلیں گی طرز خرام بدلے گا

بدلتی رہتی ہیں قدریں رحیلِ وقت کے ساتھ
زمانہ بدلے گا ہر شے کا نام بدلے گا

ہم اپنی تلخ نوائی میں رنگ بھر دیں گے
ہمارے ساتھ ہمارا کلام بدلے گا

یہ عرش و فرش کی تفریق کچھ نہیں واثق
بلند و پست کا معیار خام بدلے گا

(۲۳)

نئے گل کھلے نئے دل بنے نئے نقش کتنے اُبھر گئے
وہ پیمبران صد انقلاب جدھر جدھر سے گذر گئے

جو شہید راہِ وفا ہوئے وہ اسی خوشی میں مگن رہے
کہ جو دن تھے ان کی حیات کے غم زندگی میں گذر گئے

ابھی ساتھ ساتھ تو تھے مگر مجھے میرے حال پہ چھوڑ کر
مرے ہم جلیس کہاں گئے مرے ہم صفیر کدھر گئے

مری جستجو کو فقیہہ شہر بتا رہا ہے شریک زہر
اُسے کیا خبر کہ دماغ و دل یہی زہر کھا کے نکھر گئے

ارے او ادیب فسردہ خو ارے او مغنیِ رنگ و بو
ابھی حاشیے پہ کھڑا ہے تو بہت آگے اہلِ ہنر گئے

(۳۴)

سرودِ جوانی پہ میرا فسانہ — ابد تک سناتا رہے گا زمانہ
جہاں چوٹ کھانا وہیں مسکرانا — مگر اس ادا سے کہ رو دے زمانہ
بدلتی ہیں قدریں برنگِ زمانہ — فسانہ حقیقت حقیقت فسانہ
ابھی تک مجھے یاد ہے وہ زمانہ — کبھی اُٹھ کے چلنا کبھی بیٹھ جانا
جمودِ مسلسل سے اُکتا گیا ہوں — ذرا میرا سازِ شکستہ اُٹھانا
جو پڑتی ہے جس پر وہی جانتا ہے — نہ کوئی حقیقت نہ کوئی فسانہ
ارے شاہدِ وقت کب تک یہ باتیں — کبھی یہ بہانہ کبھی وہ بہانہ
نہ سلجھے گی جب تک تری زلف برہم — زمانے سے اُلجھا رہے گا زمانہ
دلِ مضطرب تقویت پا رہا ہے — کہ بل پڑ گئے چتونوں پر شہانہ
مجھے لوریاں اس لئے دے رہے ہیں — کہ اب کروٹیں لے رہا ہے زمانہ
دماغ اور دل کی ازل سے لڑائی — مٹا کر بنانا، بنا کر مٹانا

جوانی فنا کا لہو پی رہی ہے زمانہ بھی لو آ گیا باغیانہ
مرے حوصلوں کا پتہ دے رہا ہے ستاروں سے ذرّوں کا آنکھیں لڑانا
صدائے جرس میں وہ جھنکار بھر دی کہ تھک کر کہیں رُک نہ جائے زمانہ
یہی اب ہے رومانِ ہستی کا حاصل کہ ہمراہ تم بھی چلو شاہدانہ
یہ اشکِ محبت مگر کتنے ٹھنڈے ذرا میری نظروں سے نظریں ملانا
ابھی دُھل اٹھیں تو یہ شبنم سے آنسو اگر سوزِ دوراں کا چھیڑوں فسانہ
چمن پرورش پائے بادِ خزاں سے بنے برق کے دوش پر آشیانہ

زمانہ تو خوابِ گراں میں تھا داؔمق
مگر تیرے اشعار کا تازیانہ

اشعار

گئے ہم جان سے اے شاہدِ وقت
تری رفتار میں وہ بانکپن ہے

میں کچھ اپنے سے باتیں کر رہا ہوں
یہ تنہائی نہیں اک انجمن ہے

اُلٹ دے ساقی جتنی ہو ترے پاس
یہ خالی جام کب سے طعنہ زن ہے

نگاہوں کا اُٹھنا نگاہوں کا جھکنا
کہانی کہی اور سنی جا رہی ہے

اے ساقیٔ کیفِ ہستی خبر لے
کہ شیشے سے صہبا اُڑی جا رہی ہے

چمن میں جہاں تھا نشیمن ہمارا
بہار اب وہیں ٹھوکریں کھا رہی ہے

طوفانِ انقلاب کی ہر موجِ سربلند
پہلو میں ہے بلندیٔ ساحل لئے ہوئے
ہم رہروانِ شوق کے دیکھو تو حوصلے
اک اک قدم ہے قربتِ منزل لئے ہوئے

وہ دن گئے کہ نشیمن کو برق پھونک سکے
چمن میں اب تو شرارہ برنگِ شبنم ہے

ہماری فطرتِ آزاد پر کیا کیا کمندیں ہیں
سریلی کتنی آوازِ سلاسل ہوتی جاتی ہے
اُدھر دی جا رہی ہیں رفعتیں دیوارِ زنداں کو
اِدھر آزادیوں کی فکر کامل ہوتی جاتی ہے

ہواؤں کو اُدھر ضد ہے کہ اک تنکا نہ رہ جائے
اِدھر فکرِ نشیمن اور محکم ہوتی جاتی ہے
یقیناً آ گیا ہے میکدہ میں تشنہ لب کوئی
کہ پیتا جا رہا ہوں کیفیت کم ہوتی جاتی ہے

عنایاتِ مخصوص رہنے دے ساقی ہمیں اک نہیں ہیں یہاں اور بھی ہیں
بہت ناز بے جا نہ کر نقشِ سجدہ کہ سنگِ حرم پرستاں اور بھی ہیں

صرف محبوب سے باتوں کو اگر کہیئے غزل تو بڑی فکر کی باتوں کا زمانہ ہے ابھی

اُٹھا اُٹھا مرے ساتھی وہ شعلہ بار رباب
کہ جاگتا نہیں صرف آمدِ سحر سے شباب

اس طرح ہم ملائے گئے خاک میں جو بگولا اُٹھا کہکشاں بن گیا
خیر ہو اُس مسافر کی جس کے لئے آج ہر راہزن پاسباں بن گیا

ابر و باراں نہیں غم کا طوفاں سہی میکشی کے لئے اک بہانہ تو ہے

جام اُسی کا ہو جاتا ہے ہاتھ بڑھا کر خود جو اُٹھا لے
ناچ رہے ہیں اندھے انساں پیروں میں زنجیریں ڈالے